ماہنامہ

حکمت قرآن

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن۔ لاہور

تصانیف : ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

۱	اسلام کی نشاۃ ثانیہ کرنے کا اصل کام		۱/۵۰
۲	مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق	ادنیٰ اعلیٰ	۳/- ۴/-
۳	راہِ نجات ، سورۃ والعصر کی روشنی میں	ضخیم مختصر	۳/- ۲/-
۴	دعوت الی اللہ		۱/۵۰
۵	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت	ادنیٰ اعلیٰ	۳/- ۴/-
۶	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں	ادنیٰ اعلیٰ	۲/- ۳/-
۷	قرآن اور امن عالم		۱/۵۰
۸	علامہ اقبال اور ہم		۲/-
۹	عظمت صوم		۲/
۱۰	قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ		۱۰/-
۱۱	مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب		۱۲/-
۱۲	عید الاضحیٰ اور فلسفہ قربانی		۳/-
۱۳	سرافگندیم		۷/
۱۴	مطالبات دین		۸/-
۱۵	تحریک جماعت اسلامی	ادنیٰ اعلیٰ	۱۰ ۲۰
۱۶	شہید مظلوم	ادنیٰ اعلیٰ	۳/ ۴/
۱۷	اسلام اور پاکستان		۵/-
۱۸	تنظیم اسلامی کی دعوت		۴/-
۱۹	سانحہ کربلا		۳/-
۲۰	رسول کامل صلی اللہ علیہ وسلم		۶/-
۲۱	مسلمانوں کے فرائض دینی اور اسوۂ رسول ﷺ		۹/-
۲۲	معراج النبی ﷺ		۴/-
۲۳	اسلام میں عورت کا مقام		۱۰/-

عربی ترجمہ :

۱	ماذا یجب علی المسلمین تجاہ القرآن ؟	۵/-

فارسی ترجمہ :

۲	دین قــرآن بر گردن مسلمان	زیر طبع

انگریزی تراجم :

۳	The Obligations Muslims owe to the Quran.	۵/-
۴	The way to Salvation—in the light of Surah Al-'Asr.	۵/-
۵	Islamic Renaissance—The Real Task Ahead	۲/-
۶	The Quran & World Peace.	۲/-
۷	Rise & Decline of Muslim Ummah.	۵/-

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ : ۲۶۹)

ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

جاری کردہ : ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی : ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر : حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴

فون : ۸۵۲۶۱

ماہنامہ
حکمتِ قرآن
لاہور

فہرس

حرف اوّل ——— ۳
عاکف سعید

الٓمٓ (سورۂ عنکبوت) ——— ۵
ڈاکٹر اسرار احمد

صداقتِ قرآن کریم کی ایک نفسیاتی شہادت ——— ۱۵
سلطان احمد اصلاحی

اسلامی انقلاب ——— ۲۳
مولانا وحید الدین خان

مسلکِ سلیمانی ——— ۳۷
ڈاکٹر غلام محمد

تصوف کی حقیقت ——— ۴۹
مولانا الطاف الرحمٰن بنوی

قرآنی علم و فہم کا درجہ حکمت (قسط ۱) ——— ۶۲
مولانا محمد تقی امینی

تعارفِ کتب ——— ۶۷
ادارہ

شوال المکرم ——— ۱۴۰۴ھ
بمطابق
جولائی ——— ۱۹۸۴ء
جلد ——— ۳
شمارہ ——— ۵

زرِ سالانہ ۳۰ روپے
اس شمارہ کی قیمت ۳ روپے
مطبع: آفتاب عالم پریس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مرتّب

ماہ رمضان المبارک اپنی تمام تر سعادتوں اور برکتوں کو اپنے جلو میں لیے ہوئے رخصت ہوا۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہوں نے اس ماہِ مبارک سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے لیے عتق من النار کا سامان کیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس ماہ کے دوران دن کے اوقات کو روزے کی حالت میں بسر کیا اور ان کی راتیں قرآن حکیم کی معیت میں بسر ہوئیں۔ ایسے لوگوں کے حق میں از روئے فرمان نبوی روزہ اور قرآن دونوں شفاعت کریں گے ——— اس بار جامع القرآن، قرآن اکیڈمی میں پورے رمضان المبارک کے دوران قرآن کی معیت میں رات گزارنے کا انوکھا تجربہ کیا گیا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اس سال نماز تراویح کے ساتھ ساتھ دورۂ ترجمۂ قرآن کا پروگرام ترتیب دیا گیا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ نماز تراویح کی ہر چار رکعتوں سے قبل ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ان رکعات میں پڑھی جانے والی آیات کا ترجمہ بیان کرتے تھے اور جہاں ضرورت محسوس ہوتی ربطِ آیات کی جانب اشارہ بھی فرما دیتے تھے۔ اس دورۂ ترجمۂ قرآن کی افادیت کو اپنے کسی پیمانے سے شمار کرنا تو ہمارے لیے ناممکن ہے تاہم فوری فائدہ جو ہر شریک محسوس کرتا تھا وہ یہ تھا کہ چار یا پانچ رکوعوں کا رواں ترجمہ سننے کے بعد جب انہی آیات کی نماز تراویح میں سماعت کی جاتی تو ہر شخص کا یہ احساس ہوتا تھا کہ تلاوت آیات کے ساتھ ساتھ قرآنی آیات کا مفہوم بھی، ایک حد تک، اس کے ذہن میں اترتا جا رہا ہے۔ اور یہ ایک بہت خوش کن احساس تھا۔ ایک دوسرا فائدہ جو تمام شرکاء نے بہت شدت سے محسوس کیا وہ یہ تھا کہ محض دورۂ ترجمۂ قرآن ہی شرک کی ہر صورت کی جڑ کاٹنے اور شفاعتِ باطلہ کے ہر تصور کی نفی کرنے کے لیے کافی ہے۔ بہت سے لوگوں کا تاثر یہ تھا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ہماری نگاہوں کے سامنے حجاب تھا جو ترجمۂ قرآن سننے سے دُور ہو گیا ہے۔

دورۂ ترجمہ قرآن کے دوران قرآن کے اعجاز اور اس کی برکات کا عجیب مشاہدہ ہوا۔

کہ موسم کی انتہائی شدت کے باوجود شائقین نے نہایت ذوق وشوق سے پورا ماہ اس پروگرام میں شرکت کی۔ اور شرکاء کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہی ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ آخری عشرے کے آغاز ہی سے مسجد کا ہال اپنی تمام تر وسعت کے باوجود تنگ پڑ گیا۔ اور ۲۷ ویں اور ۲۹ ویں شب تو شرکاء کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ مسجد کے صحن کی تنگ دامانی بھی عیاں ہو گئی۔

زیر نظر شمارہ قدرے تاخیر سے قارئین کے ہاتھوں میں پہنچے گا جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ اس شمارے میں "اسلامی انقلاب" کے عنوان سے مولانا وحید الدین خان صاحب کا فکر انگیز مقالہ یقیناً قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ یہ مقالہ مولانا نے محاضراتِ قرآنی کے لیے تیار کیا تھا بعض وجوہات کی بناء پر مولانا کے لیے محاضرات کے موقع پر بھارت سے پاکستان تشریف لانا ممکن نہ ہوا تاہم ان کی محبت اور عنایت کا یہ مظہر ہے کہ انہوں نے یہ قابل قدر مقالہ ہمیں بھیج دیا۔

دیگر مضامین میں ڈاکٹر غلام محمد صاحب کا نہایت وقیع مقالہ 'مسلک سلیمانی' اور مولانا الطاف الرحمٰن صاحب بنوی کے محققانہ مقالے 'تصوف کی حقیقت' کی پہلی قسط شاملِ اشاعت ہیں یہ دونوں مقالے عالیہ محاضرات قرآنی میں پیش کیے گئے تھے مولانا سلطان احمد اصلاحی صاحب کا قابل قدر مضمون 'صداقتِ قرآنی کی نفسیاتی شہادت' ہمیں ادارہ تحقیق و تصنیف علی گڑھ سے موصول ہوا ہے جس کے لیے ہم مولانا موصوف کے شکر گزار ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ اس تحقیقی ادارے اور خصوصاً مولانا سلطان احمد اصلاحی کا تعاون ہمیں آئندہ بھی حاصل رہے گا۔ ہمیں افسوس ہے کہ سلسلہ وار مضمون 'مروجہ نظامِ زمینداری اور اسلام' کی قسط اس بار ہم شاملِ اشاعت نہیں کر سکے۔ آئندہ اشاعت میں اس کی جو قسط شامل ہو گی وہ غالباً اس سلسلے کی آخری قسط ہو گی۔

عارف سعید

۱۲/۷/۸۲

سلسلۂ تقاریر الٓمٓ

سورۂ عنکبوت

ڈاکٹر اسرار احمد

السلام علیکم ، نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم اما بعد،

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم　　بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

الٓمٓ ۚ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا

وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ہ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ

فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْکٰذِبِیْنَ ہ

صدق اللّٰہ العظیم

سورۂ قصص کے بعد قرآن حکیم میں چار وہ سورتیں ہیں، جن کا آغاز حروف مقطعات "الٓمٓ" سے ہوتا ہے۔ یعنی سورہ عنکبوت، سورہ روم، سورہ لقمان اور سورہ سجدہ ۔ ان چاروں سورتوں کا زمانۂ نزول تقریباً ایک ہی ہے ۔ یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قیام مکہ کے وسطی دور کا نصف اوّل گویا کہ آغاز وحی کے بعد چوتھے یا پانچویں سال یہ چاروں سورتیں نازل ہوئی ہیں ۔ جہاں تک حروف مقطعات "الٓمٓ" کا تعلق ہے، یہ عرض کیا جاچکا ہے کہ اگرچہ ان کے حتمی اور قطعی معنی تو کسی کو معلوم نہیں، سوائے اللہ اور اسکے رسول کے صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ۔ تاہم حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا ایک قول ہے کہ یہ مخفف ہے ایک مکمل جملے کا ۔ "اَنَا اللّٰہُ اَعْلَمُ" میں اللہ سب سے بڑھ کر جاننے والا ہوں' — واللہ اعلم !

سورہ عنکبوت جو ۶۹ آیات اور سات رکوعوں پر مشتمل ہے، ابتدا سے

آخیر تک ایک ہی مسلسل اور مربوط مضمون ہے کہ جو اس میں جاری ہے اور وہ مضمون ہے شدائد و مصائب اور ابتلاء و آزمائش میں اہل ایمان کا کردار۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہیئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ مکرمہ میں اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو وہاں جو ابتدائی ردِّعمل سامنے آیا، وہ تمسخر اور استہزاء کا تھا۔ گویا کہ یوں کہیے کہ مخالفین نے کوشش کی کہ حضورؐ کی دعوت کو چٹکیوں میں اڑا دیں۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ دعوت تو جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہی ہے اور ہمارا نوجوان طبقہ بھی اس سے متأثر ہو رہا ہے۔ اور بالخصوص غلاموں میں سے کثیر تعداد میں لوگ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آئے ہیں۔ تو پھر دوسرے ردِّعمل کا ظہور ہوا۔ اور وہ تھا PERSECUTION یعنی شدید تعذیب و تشدّد کا عمل۔

یہ معاملہ ۵ نبوی میں اپنے پورے عروج کو پہنچ گیا۔ اس زمانے کا ایک واقعہ حضرت خبابؓ بن ارت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقل فرماتے ہیں اور یہ واضح رہے کہ حضرت خبابؓ وہ ہیں کہ جنہیں کفار نے دہکتے ہوئے انگاروں پہ ننگی پیٹھ کے بل لٹا دیا تھا۔ اور ان کی کمر کی چربی سے آگ ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب شدائد و مصائب آخری حد تک پہنچ گئے اور ناقابل برداشت ہو گئے تو ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہم نے عرض کیا کہ حضورؐ! اللہ کی مدد کب آئے گی۔ یہ صورت حال اب تک جاری رہے گی؟! اس پر آپؐ نے اظہارِ ناراضگی فرمایا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگ جلدی مچا رہے ہو۔ تم سے پہلے جو لوگ اس راستے پر آئے ان کے ساتھ تو ایسا بھی ہوا کہ کسی اللہ کے ماننے والے کو لایا جاتا تھا اور ایک گڑھے میں اس کو گاڑ دیا جاتا تھا۔ اور پھر ایک آرا اسکے سر پر رکھ کر چیرنا شروع کر دیتے تھے۔ اور اسکے کے پورے جسم کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ لوگوں کی ہڈیوں پر سے ان کے

گوشت کو لوہے کی کنگھیوں سے کھرچ دیا جاتا تھا۔ توحید کے ماننے والوں کے ساتھ ایسا بھی ہوا کہ انہیں زندہ آگ میں جلا دیا گیا۔ خدا کی قسم تم صبر سے کام لو تو وہ وقت آکر رہے گا جبکہ ایک سوار صنعا سے حضر موت (یمن کا ایک مقام) تک کا سفر کرے گا اور اسے اللہ کے سوا کسی اور سے خوف نہ ہوگا۔ بالکل یہی انداز ہے اس سورۂ مبارکہ کے پہلے رکوع میں۔ جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اہل ایمان کی طرف سے ان مصائب اور مشکلات پر جس گھبراہٹ کا اظہار ہو رہا ہے اس پر کسی قدر اظہار خفگی ہے۔ اور کچھ زجر ہے اور تنبیہ ہے۔ فرمایا جاتا ہے۔

الٓمّٓ ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ ۝

کیا لوگوں نے یہ سمجھا تھا کہ وہ صرف یہ کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ اور ان کو آزمایا نہ جائے گا۔ حالانکہ ہمارا تو یہ مستقل طریقہ رہا ہے کہ ہم تو بالکل کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ کہ کون سچے ہیں یعنی اپنے دعوائی ایمان میں اور کون جھوٹے ہیں۔ یعنی ایمان کے جھوٹ موٹ کے دعویدار۔

یہ بات اسی رکوع کے آخیر میں مزید واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِیَ فِی اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ (۱۰)

لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں کہ جو کہتے تو یہ ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے۔ لیکن جب ان کو لوگوں کی طرف سے آزمایا جاتا ہے۔ ابتلاء اور مصیبت میں مبتلا کیا جاتا ہے تو وہ ایسے گھبرا اٹھتے ہیں جیسے اللہ کے عذاب سے گھبرانا چاہیئے۔

اس کے آخیر میں فرمایا گیا۔

وَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ ۝ (۱۱)

اللہ تعالیٰ انہی آزمائشوں اور انہی امتحانات کے ذریعے واضح کر دیتا ہے

کہ کون حقیقتاً مومن ہے اور کون درحقیقت منافق ہیں - اور صرف جھوٹ موٹ کا دعوئی ایمان کر رہے ہیں -

یہ انداز ہے اس سورہ مبارکہ کے آغاز کا - اگرچہ اہل ایمان کی دلجوئی اور تسلی و تشفی بھی ساتھ ساتھ ہے جیسے کہ کسی بھی ماہر تربیت کے انداز میں ہونی چاہیئے - چنانچہ یہ تشفی بھی آئی ہے -

مَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ (۵)

جو کوئی بھی اللہ سے ملاقات کی اُمید میں یہ ساری سختیاں جھیل رہا ہے، اسے مطمئن رہنا چاہیئے کہ اللہ کا معین وقت آکر رہے گا - مزید یہ کہ بڑے ہی پرزور وعدے بھی کئے گئے ہیں اور ان وعدوں میں انتہائی EMPHASIS ہے - بڑے ہی یقین کے ساتھ فرمایا گیا کہ جو لوگ اس راہ پر ثابت قدم رہیں گے -

لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ - (۷)

ہم یقیناً ان سے ان کی برائیوں کو دور کر دیں گے -

وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (۷)

اور ہم انہیں انکے اعمال کا بہترین بدلہ دیں گے - پھر آگے چل کر فرمایا

لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ (۹)

ہم ان کو یقیناً اپنے صالح اور نیکوکار بندوں میں شامل فرمائیں گے -

اس کے بعد تین رکوعوں میں یعنی دوسرے تیسرے اور چوتھے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اولوالعزم پیغمبروں کا ذکر فرمایا ہے - اس ضمن میں حضرت نوح علیہ السلام کے ذکر سے آغاز ہوا کہ انہوں نے ساڑھے نو سو برس تک اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی - قوم استہزاء کرتی رہی انکار کرتی رہی، مذاق اڑاتی رہی لیکن وہ پورے صبر و ثبات کے ساتھ اپنے فرض منصبی کو ادا کرتے رہے - گویا کہ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام کے لئے ایک تلقین پوشیدہ ہے - وہی بات جو سورہ احقاف میں آچکی ہے،

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ

صبر کیجئے جیسا کہ ہمارے اولوالعزم پیغمبر صبر کرتے ہیں ۔

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے اور ان کے تذکرے میں شرک کے بارے میں ایک بہت ہی عمدہ تمثیل آئی ہے کہ درحقیقت شرک کے لئے فطرت انسانی میں کوئی بنیاد موجود نہیں ہے ۔ بلکہ فطرت تو توحید پر ہے ۔ البتہ یہ کہ لوگ اس شرک پر اس لئے قائم رہ جاتے ہیں، کہ جو مشرکانہ نظام چلا آرہا ہے، اسی کی وجہ سے ان میں مودت رہتی ہے ۔

مَوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

حیات دنیاوی میں تمہارے مابین آپس کے تعلقات میں بھائی چارا ہے ۔ محبتیں ہیں، منفعتیں ہیں ۔ مفادات ہیں ۔ اس مشرکانہ نظام سے تمہارے یہ تعلقات ہیں لہٰذا تم شرک پر اڑے ہوئے ہو ۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ فطرت انسانی میں شرک کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے ۔

اس کے بعد قوم عاد اور قوم ثمود کا ذکر ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون اور قارون اور ہامان کا ذکر ہے ۔ اور ان سب کے تذکرے کا حاصل یہی ہے کہ یہ معاملہ جو آج مسلمانو! تمہارے سامنے ہے جس سے تمہیں سابقہ پیش آرہا ہے یہ آج کوئی پہلی مرتبہ ایسا نہیں ہوا ۔ ہمیشہ تاریخ میں یہ معاملات اسی طرح ہوتے رہے ہمارے پیغمبروں نے دعوت حق دی اور جواباً منکرین کی طرف سے کفار کی طرف سے اسی طرح کا طرز عمل ظاہر ہوا ۔ جیسا کہ آج مکہ کے کفار اور مشرکین کی طرف سے ہو رہا ہے ۔

آخری تین رکوعوں میں یعنی رکوع نمبر ۵، ۶، ۷، میں اہل ایمان کو ہدایات دی گئی ہیں کہ اس قسم کے حالات سے جب مسلمان دوچار ہوں، یہ شدائد یہ مصائب، یہ مشکلات، یہ امتحانات، یہ PERSECUTION ہو تو اس میں ثابت قدم رہنے کے لئے چار موٹی موٹی باتیں ہیں کہ جن کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے ۔

سب سے اہم چیز کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط رکھو۔ اور اس کا ذریعہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تلاوت ہے، نماز کا قائم کرنا ہے اور اللہ کا ذکر ہے۔

اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ (۴۵)

سب سے بڑی چیز درحقیقت تعلق مع اللہ ہے۔ اور قیام صلوٰۃ ہے اور اللہ کی یاد ہے۔ نماز وہ چیز ہے جو فحش اور بُرے کاموں سے روکتی ہے۔ دوسری ہدایت یہ دی گئی کہ یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ دُنیا کی زندگی عارضی زندگی ہے ایک کھیل تماشے سے زیادہ اس کی حقیقت نہیں ہے۔ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔ کاش! ان کو اس کا صحیح و حقیقی شعور ہوتا۔

وَمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ۝ (۶۴)

تیسری ہدایت، اور اس میں درحقیقت ایک لطیف اشارہ پنہاں تھا ہجرت حبشہ کی طرف، وہ ہدایت یہ ہے کہ

یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا

اے میرے وہ بندو! جو ایمان لائے ہو،

اِنَّ اَرْضِیْ وَاسِعَةٌ فَاِیَّایَ فَاعْبُدُوْنِ ۝ (۵۶)

میری زمین بڑی کشادہ ہے۔ بس تم صرف میری ہی بندگی کرو۔ اگر کسی ایک مقام پر تمہارے لئے توحید پر گامزن رہنا، ثابت قدم رہنا ممکن نہ رہے تو اس زمین کو خیرباد کہہ دو۔ اللہ کی زمین کو تم کشادہ پاؤ گے۔ کہیں اور چلے جاؤ۔ لیکن کسی صورت میں بھی توحید کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔

آخری آیت مبارکہ میں تو اہل ایمان کے لئے ایک بہت ہی بڑی خوشخبری، بہت ہی حوصلہ افزا نوید جانفزا ہے۔ فرمایا۔

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ

اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (۶۹)

اللہ تعالےٰ کا پختہ وعدہ ہے کہ جو لوگ ہماری راہ میں محنتیں کریں گے، کوششیں کریں گے، ہمارا یہ پختہ وعدہ ہے ان سے کہ ہم اُن پر اپنے راستے کھولتے چلے جائیں گے۔ اور اللہ تعالےٰ کی معیت حاصل ہے ان کو جو احسان کی روش اختیار کرتے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ

پروردگارا ہمیں بھی ان لوگوں میں شامل فرما۔ آمین یارب العٰلمین

وَآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

(بقیہ: صداقت قرآن کریم کی ایک نفسیاتی شہادت)

دوسرے حال سے مخالف نظر آوے اور قرآن شریف جو خالق کا کلام ہے — یہاں ہر چیز کے بیان میں دوسری جانب بھی نظر ہوتی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہو کہ ہر چیز کا بیان ہر مقام میں ایک راہ پر ہے۔ یہاں منافقوں کا مذکور تھا تو ہر بات پر الزام اسی قدر ہے جتنا چاہیے اور جماعت میں سے انہیں پر الزام ہے جو لائق الزام ہیں۔ اسی واسطے فرمایا کہ بعضے ان میں سے یوں کرتے ہیں —" (موضح القرآن)

لَا یَاْتِیْہِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْہِ وَلَا مِنْ خَلْفِہٖ ط
تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٍ ۝

ایسے میں اللہ نے اس کی دلجوئی کے لیے فرشتوں کا نزول فرمایا جو اہل ایمان کی دلجوئی فرماتے ہیں پھر ان کے لیے انتہائی خوش کن بشارتیں ہیں کہ ان پر ایسی حالت آنے والی ہے جہاں نہ کوئی خوف ہو گا نہ غم، ان کا ہمیشہ کا ٹھکانا جنت ہے اور اس میں ان کی تمام خواہشات پوری کر دی جائیں گی۔ اور سب سے بڑی خوشخبری یہ کہ اللہ فرما رہا ہے کہ اگر تم ثابت قدم رہے تو ہماری ولایت کے مستحق ہو گے دنیا میں اور آخرت میں۔ یہی دلجوئی اور خوشخبری نبی اکرم کا سب سے بڑا سہارا ہوتی تھی جب وہ حالات سے بالکل مایوس ہو جاتے تھے۔

مذکورہ بالا احادیث اور آیات ربنا اللہ کے کلمے پر ثابت قدم رہنے کی اہمیت کو واضح کرتی ہیں۔ یہ ثابت قدمی ہی فلاح و نجات کی راہ ہے۔ جیسا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جامع کلمات میں اپنے ایک صحابی کو بتا دیا کہ اسلام کا لب لباب یہ ہے کہ کہو میں ایمان لایا اللہ پر۔ پھر اس پر ثابت قدم رہو۔

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا۔

ڈاکٹر ابصار احمد ڈائرکٹر قرآن اکیڈمی

کی تالیف (بزبان انگریزی) صفحات ـ ۱۶۰

کانٹ اور کرکیگارڈ

ایک تقابلی مطالعہ

عمدہ کاغذ ۔ دلآویز طباعت ۔ قیمت -/۴۰ روپے

ناشر: مکتبہ کارواں، کچہری روڈ، لاہور

صداقت قرآن کریم کی ایک نفسیاتی شہادت

— سلطان احمد اصلاحی علی گڑھ

قرآن کریم نے اپنے تئیں من جانب اللہ ہونے اور غیر انسانی کلام ہونے کے سلسلے میں بہت سے دلائل پیش کئے ہیں۔ ان کے ... پہ یہ بات کہ انسان جس کسی کو چاہے اپنی مدد کے لئے بلالے وہ قرآن جیسی ایک سورت بھی پیش کرنے سے عاجز رہے گا۔ (بقرہ۔ ۲۳) نیز یہ کہ سارے انسان اور جن مل کر بھی اگر قرآن جیسا کلام تیار کرنا چاہیں تو ایک دوسرے کی حمایت اور پشت پناہی کے باوجود انہیں اپنے منہ کی کھانی پڑے گی (بنی اسرائیل۔ ۸۸) وغیرہ۔ ان میں سے اہم دلائل کی ایک بات قرآن یہ کہتا ہے کہ اگر وہ کلام اللہ نہ ہوتا بلکہ کوئی انسانی کلام ہوتا تو اس میں بڑا اختلاف اور تفاوت نظر آتا۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ وَلَوْ	کیا یہ قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر
كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا	یہ اللہ کے سوا کسی اور کا ہوتا تو اس میں
فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا	بہت اختلاف اور تفاوت نظر آتا۔

(نساء ۔ ۸۲)

انسانی کلام اختلاف اور تفاوت سے مبرا نہیں ہو سکتا اور قرآن اس نقص سے پاک ہے۔ یہ اس بات کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے کہ وہ کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ ایک غیر انسانی اور زیادہ صحیح لفظوں میں 'فوق الانسانی' کلام ہے۔ اس مختصر سی آیت میں صداقتِ قرآن کی ایک بہت اہم نفسیاتی شہادت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے آج کی مجلس میں ہم اسی کے مضمرات پر غور کرنے کی کوشش کریں گے۔

انسان اور خدا میں کیا فرق ہے؟ اس کا بہت مختصر اور جامع جواب یہ ہے کہ انسان 'محدود' ہے اور خدا 'لامحدود'۔ انسان کا علم محدود ہے، اس کی صلاحیتیں محدود ہیں۔ اس کی رسائی محدود ہے اور اس کی قوتِ فیصلہ اور قوتِ برداشت محدود ہے۔ خدا تعالیٰ کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس کا علم لامحدود ہے، اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ ہر چیز اس کی دسترس میں ہے اور کوئی چیز اس کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔ اس کا فیصلہ عدل و توازن کا شاہکار اور اس کی قوتِ برداشت بے پایاں اور لامتناہی ہے۔ کسی شخص کا کلام اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ظرف میں جو کچھ ہوتا ہے وہی اس سے چھلکتا ہے۔ نیز یہ کہ ایک شخص کی گفتگو سے اس کی پوری شخصیت کو ناپ لیا جا سکتا ہے ؎

تا مردِ سخن نگفتہ باشد عیب و ہنرش نہفتہ باشد

یہ بات جہاں فرد کی نسبت سے درست ہے وہیں اسے پوری جمعیت انسانی کے لئے بطور معیار کے پیش کیا جا سکتا ہے۔ انسان کی اسی محدودیت کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنے کلام میں بے لاگ عدل و توازن کو ملحوظ نہیں رکھ پاتا اور افراط و تفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی چیز کو قرآن اختلاف اور تفاوت سے تعبیر کرتا ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جس پر پوری تاریخِ انسانی کی شہادت ثبت ہے اور انسانی کلام کے ذخیرے کا ایک ایک حرف اس کی صداقت کا اعلان کرتا ہے۔

انسانی کلام کا جو ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے نمونے طور پر اسے ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جسے ہم انسان کی داخلی فکر یا دوسرے لفظوں میں حقیقت کی معروضی دریافت کا مظہر قرار دے سکتے ہیں۔ دوسرے وہ کلام ہے جو دوسرے انسانوں کے ساتھ انسان کے ردعمل (Re action) کے طور پر وجود میں آتا ہے۔ ان دونوں ہی نوع کے کلاموں میں ہم قدم قدم پر اختلاف و تفاوت کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ بلکہ صحیح تر لفظوں میں اگر ہم انہیں 'مجموعۂ تضادات' کا نام دیں تو بے جا نہ ہوگا۔ سقراط (۴۶۹ - ۳۹۹ ق م) کو فکر و فلسفہ کا امام کہا جاتا ہے اور حقائق کائنات کی داخلی دریافت کے سلسلے میں اسے 'معمارِ اوّل' کا مقام حاصل ہے۔ اور اس کی عظمت و بڑائی کے اعتراف کے سلسلے میں صرف یہ بات کافی ہے کہ مہ و سال کی ہزار بار گردش کے باوجود انسانی دماغ آج بھی اس کے نتائج فکر سے بے نیاز نہیں ہو سکا ہے ——— لیکن خود نفس علم کے سلسلے میں اس کا اعتراف ہے کہ یہ

کوئی متعین چیز نہیں جس کا سرا وہ ہر آدمی کے ہاتھ میں پکڑا سکے۔ کارل جیسپر اس کے اس خیال کو ان الفاظ میں نقل کرتا ہے :[1]

IT MEANS THAT EACH MAN MUST FIND KNOWLEDGE IN HIMSELF IT IS NOT A COMMODITY THAT CAN BE PASSED FROM HAND TO HAND, BUT CAN ONLY BE AWAKENED.

(اس کا مطلب ہے کہ ہر آدمی کو علم کی تلاش خود اپنے اندر کرنی چاہیے۔ علم کوئی تماشہ نہیں ہے کہ اسے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کیا جاتا رہے۔ اسے تو بس انسان کے اندرون میں بیدار کیا جا سکتا ہے)

چنانچہ آگے خود یہی مصنف اعتراف کرتا ہے کہ گو کہ سقراط کے ساتھ رابطہ انسان کو غور و فکر کے لیے مہمیز کا کام دیتا تھا۔ سقراط کے تمام پرستاروں کا یہی تجربہ تھا۔ لیکن اس کے مرنے کے ساتھ ہی ان کے درمیان اختلافات در آئے اور ہر شخص الگ الگ سمتوں میں سوچنے لگا۔[2]

CONTACT WITH HIM INSPIRED MAN TO THINK, THIS WAS THE EXPERIENCE OF ALL THE SOCRATICS. BUT IMMEDIATELY AFTER HIS DEATH FRAGMENTATION SET IN EACH ONE BEGAIN TO THINK IN A DIFFERENT DIRECTION.

اس سے ملتے جلتے خیالات اس کے شاگرد افلاطون (۴۲۸ - ۳۴۷ ق م) کے بھی تھے جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا انسانی کلام کا دوسرا حصہ وہ ہے جو دوسرے انسانوں کے ساتھ اس کے ردِ عمل کے طور پر وجود میں آتا ہے۔ اس دائرے میں انسان کی تنگ دامانی اور بھی نمایاں ہے اور دراصل یہی پہلو ہے جسے آج کی گفتگو میں خاص طور پر نمایاں کرنا پیشِ نظر ہے۔ ہٹلر (۱۸۸۹ - ۱۹۴۵ء) ایک عظیم جرنیل ہونے کے ساتھ ایک بے مثال خطیب اور صاحبِ قلم بھی تھا۔ انسانی نسلوں کے سلسلے میں جب وہ رائے زنی کرتا ہے تو ان کے متعلق وہ یہ فتویٰ صادر کرتا ہے۔

---

1. (Karal Jespers : The Great Philosophers, P. 18).

2. Ibid, P. 27).

"RACES ARE NOT ONLY TO BE KEPT DISTINCT, BUT SOME ARE MANIFESTLY SUPERIOR THAN OTHERS APART FROM THE QUESTION OF PURITY. OF THESE THE ARYAN RACE IS AGAIN OUTSTANDING. ALL THE HUMAN CULTURE, ALL THE RESULTS OF ART, SCIENCE AND TECHNOLOGY THAT WE SEE BEFORE US TODAY. ARE ALMOST EXCLUSIVELY THE CREATIVE PRODUCT OF ARYAN."

(نسلوں کو نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے ممتاز ہونا چاہیئے بلکہ بہت سی نسلیں، علاوہ اپنی بے آمیزی کے، دوسری تمام نسلوں سے فائق تر ہیں۔ یہاں بھی ایک نسل دوسری تمام نسلوں سے نمایاں ہے، تمامتر انسانی تہذیب، اسی طرح ادب، سائنس اور ٹیکنالوجی کے تمام نتائج جنہیں ہم آج اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھتے ہیں، یہ سب تقریباً تمام کی تمام مخصوص طور پر آریہ نسل کی تخلیقی پیداوار کا نتیجہ ہیں۔)

اسی طرح جب اس نے اپنے ملک میں یہودیوں کے خلاف شمشیر انتقام نکالی تو اس قوم کی نسبت سے اس نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ یہ تھے۔

THE JEWS WERE TO LITTLE BETTER THAN PARASITIC ANIMALS WHICH MUST BE WIPED OUT. AS LONG AS ONE JEW REMAINED IN GERMANY, THE WORLD'S GREATEST CULTURE WAS IN DANGER BECAUSE, HISTORY DEMONSTRATES THAT ALL NATIONS RECEIVING THE JEWS AMONG THEMSELVES AND GIVING THEM THE SAME RIGHTS SOONER OR LATER PERISH FROM THE JEWISH POWER.

(یہودی کیڑے مکوڑوں سے کچھ ہی بہتر ہیں جن کا روئے زمین سے لازماً صفایا ہو جانا چاہیئے۔ جب تک ایک یہودی بھی جرمنی میں باقی رہے گا، دنیا کی اس عظیم ترین تہذیب کو خطرہ لاحق رہے گا۔ اس لئے کہ تاریخ شاہد ہے کہ جن قوموں نے بھی یہودیوں کی اپنے اندر پذیرائی کی اور انہیں اپنے جیسے حقوق عطا کئے وہ جلد یا بدیر یہودی زہر سے ہلاک ہو گئیں)۔

---

3. (Lawrence-C. Wanlass: History of Political Thought, P. 378.) (Ibid P. 379).

مسلک کے اوپر فاشزم کی چھاپ لگی ہوئی ہے اس لئے اس کے ان خیالات کو ہو سکتا ہے کہ انتہا پسندی کا آئینہ دار قرار دے کر ٹال دیا جائے، لیکن حالیہ انسانی تاریخ میں کمیونزم کو جو قبول عام ہے اس سے تو کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اس نظریئے کا عظیم ترین ہیرو اور مقبول ترین لیڈر لینن (۱۸۷۰ - ۱۹۲۴ء) بھی جب اپنے مزدور پیروؤں کو اپنے مقصد میں آگے بڑھنے کے لئے للکارتا ہے تو اس کی انتہا پسندی بھی اوروں سے کم نہیں ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے

"ہم ہر اس اخلاق کو رد کرتے ہیں جو عالم بالا کے کسی تصور پر مبنی ہو یا ایسے خیالات سے ماخوذ ہو جو طبقاتی تصورات سے ماورا رہیں۔ ہمارے نزدیک اخلاق قطعی اور کلی طور پر طبقاتی جنگ کا تابع ہے۔ ہر وہ چیز اخلاقاً بالکل جائز ہے جو پرانے نفع اندوز اجتماعی نظام کو مٹانے کے لئے اور محنت پیشہ طبقوں کو متحد کرنے کے لئے ضروری ہو۔ ہمارا اخلاق بس یہ ہے کہ ہم خوب مضبوط اور منظم ہوں اور نفع گیر طبقوں کے خلاف پورے شعور کے ساتھ جنگ کریں۔ ہم یہ مانتے ہی نہیں کہ اخلاق کے کچھ ازلی اور ابدی اصول بھی ہیں۔ ہم اس فریب کا پردہ چاک کر کے رہیں گے۔ اشتراکی اخلاق اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مزدوروں کی مطلق العنان حکومت کو مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے کے لئے جنگ کی جائے۔"

"ناگزیر ہے کہ اس کام میں ہر چال، فریب، غیر قانونی تدبیر، حیلے بہانے اور جھوٹ سے کام لیا جائے۔"[1]

کہا جا سکتا ہے کہ یہ خدا بیزار انسانوں کے ردعمل کی مثالیں ہیں جن کا جادۂ اعتدال سے ہٹ کر انتہا پسندی کا شکار ہو جانا بالکل فطری سی بات ہے لیکن قرآن ہی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے، خدا شناس افراد بھی، توفیق ایزدی سے محروم ہو کر جب دوسرے انسانوں کی نسبت اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں تو ان کی بے اعتدالی اور انتہا پسندی بھی دوسروں سے کم نہیں ہوتی ہے۔ قرآن نے یہود و نصاریٰ کی جو داستان بیان کی ہے اس کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل عیاں ہے چنانچہ ان کا خیال تھا کہ جنت میں ان کے سوا کوئی دوسرا داخل نہ ہوگا۔ وَقَالُوا لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ (بقرہ - ۱۱۱)

اسی طرح وہ اپنے کو مخصوص طور پر اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے تصور کرتے تھے۔

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی: اسلام اور جدید معاشی نظریات / ۶۹

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ ـ ۱۸)

ایک طرف تو ان کی اپنے بارے میں یہ خوش گمانی تھی اور تھوڑی ہی دیر بعد جب وہ ایک دوسرے کے خلاف آستینیں چڑھاتے تو ہر ایک دوسرے کو گمراہ قرار دیتا۔ یہود نصاریٰ کو گمراہ کہتے اور نصاریٰ یہود کو گم کردہ راہ بتاتے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصَارٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصَارٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ۔ (بقرہ ـ ۱۱۳) لیکن آپس کی اس فتوے بازی کے بعد جب مسلمانوں کی طرف عنایت کا رخ کرتے تو انہیں کافروں اور مشرکوں سے بھی زیادہ گیا گزرا بتاتے اور کہتے کہ کافران سے زیادہ راہ یاب ہیں:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا۔ (نساء ـ ۵۱)

اہل کتاب کی ان الزام تراشیوں سے قطع نظر یہ ایک حقیقت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ کا سب سے بڑا روڑا یہی یہود و نصاریٰ تھے اور اسلام اور پیغمبر اسلام کی مخالفت میں ایک طرح سے ان کا کردار کفار و مشرکین سے بھی زیادہ گھناؤنا تھا۔ مکہ کے سادہ لوح مشرکین کو اکسانے اور بھڑکانے والے دراصل یہی لوگ تھے اور اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف سازش کے جو جال بنے جاتے اس کے پس پردہ انہیں کا ہاتھ کام کر رہا ہوتا تھا۔ قرآن اسی نبی اُمّی کی زبان پر نازل ہوتا ہے جو اپنی پوری پیغمبرانہ زندگی میں ان کی سازشوں کا ستم خوردہ ہے۔ لیکن کسی ایک مقام پر وہ ان کے متعلق کوئی ایسی بات نہیں کہتا جو جادۂ اعتدال سے ہٹی ہوئی ہو اور ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ وہ جوش انتقام میں آکر من حیث القوم ان کو مطعون کرنے لگے وہ ان میں سے مجرم صرف انہی لوگوں کو قرار دیتا ہے جو واقعی مجرم ہیں اور جو جادۂ حق پر ہیں وہ علی الاعلان ان کی سلامت روی کا اعتراف کرتا ہے چنانچہ وہ صاف صاف کہتا ہے کہ سارے اہل کتاب ایک سے نہیں۔ ان میں بہتیرے ہیں جو سیدھی راہ پر قائم ہیں:

لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ۔ (آل عمران ـ ۱۱۳)

اسی طرح وہ کھلے لفظوں میں اعتراف کرتا ہے کہ اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ہیں جو اس

کے نازل کردہ کلام پر ایمان رکھتے ہیں۔

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ۔

(ایضاً۔ ۱۹۹)

اسی طرح جب وہ ان کے جرائم بیان کرتا ہے تو ایک ہی سانس میں پوری قوم کو مجرموں کے کٹہرے میں لا نہیں کھڑا کرتا ہے۔ بلکہ صرف انہی کو مجرم بتاتا ہے جو واقعی مجرم ہیں۔ چنانچہ جہاں وہ ان کی بد دیانتی اور حرام خوری کا تذکرہ کرتا ہے وہیں وہ اس کا بھی اعتراف کرتا ہے کہ ان میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جن کا دامن اس جرم سے پاک ہے اور وہ امانت کا پاس ولحاظ رکھتا ہے۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۭ (ایضاً۔ ۷۵)

دوسرے مقامات پر بھی اس کا یہی حال ہے کہ جو لوگ واقعی مجرم ہیں وہ صرف انہیں کو مجرم گردانتا ہے۔

(۱) وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ (بقرہ۔ ۱۰۹)

(۲) وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ (آل عمران۔ ۶۹)

(۳) وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۔

(ایضاً۔ ۷۲)

(۴) اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ۔ (ایضاً۔ ۱۰۰)

چنانچہ خود آیت زیر بحث جس سے پہلے اہل کتاب منافقین کا تذکرہ چل رہا ہے۔ وہاں بھی اس نے ان کی ریشہ دوانیوں کا پردہ فاش کرتے ہوئے 'کچھ ہی لوگوں' کو اس جرم کا مرتکب بتایا ہے اور انتقام کے نشے میں پوری قوم کو اس میں ملوث نہیں قرار دے دیا ہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۭ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى

اللّٰہُ وَکَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا ○ (نساء ۔ ۸۱)

یہی حال مشرکینِ مکہ کا بھی تھا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر طرح طرح کے الزامات کی بوچھاڑ کرتے کبھی آپ کو 'ساحر' اور 'مجنون' قرار دیتے۔ کبھی کہتے کہ معاذ اللہ آپ پر کوئی آسیب سوار ہو گیا ہے۔ کبھی کہتے کہ یہ قرآن انہیں کوئی دوسرا املاء کرا دیتا ہے۔ کبھی کہتے کہ اگر یہ قرآن اترنا ہی تھا تو مکّے اور طائف کے کسی بڑے سردار کے اوپر اترا ہوتا۔ کبھی کہتے کہ اگر یہ نبی ہیں تو ان کے اوپر خزانے کی بارش کیوں نہیں ہوتی اور ان کے جلو میں فرشتے کیوں نہیں چلتے۔ کبھی کہتے کہ کیا یہی پھٹے حال لوگ رہ گئے تھے جن پر اللہ کو اپنا خصوصی انعام کرنا تھا۔ کبھی کہتے کہ اگر یہ کوئی بھلی بات ہوتی تو بھلا یہ ہم سے آگے کیسے نکل سکتے۔ وغیرہ وغیرہ لیکن ان تمام یاوہ گوئیوں کو سن کر رسولِ خدا کبھی قابو سے باہر نہیں ہوتا اور ان کے اوپر کبھی کوئی جوابی الزام عائد نہیں کرتا۔ بلکہ انہیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہے اور صرف اپنی پوزیشن کو واضح کر کے خاموش ہو جاتا ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۚ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا ۚ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۚ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ ۔ (سباء ۔ ۴۶)

انسانی کلام کی انہی بے اعتدالیوں اور اسی اختلاف و تفاوت پر آپ دوسرے تمام انسانی کلاموں کو قیاس کر سکتے ہیں حضرت شاہ عبد القادرؒ نے کتنی گہری بات کہی ہے۔ آیت زیرِ بحث پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"یعنی مخلوق ہر حال میں اس حال کے موافق بولتا ہے۔ غصّے میں مہربانی والوں کی طرف دھیان نہیں رہتا اور مہربانی میں غصّے والوں کی طرف۔ دنیا کے بیان میں آخرت یاد نہ آوے اور آخرت کے بیان میں دنیا۔ بے پروائی میں عنایت کا ذکر نہیں اور عنایت میں بے پروائی کا۔ تو اس حال کا کلام سنے

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

۱تا۶: ان آیتوں کے حوالے بالترتیب یہ ہیں۔ ذاریات ۵۲ ۔ ھود ۔۱۲/۵۔ فرقان ۵ ۔ زخرف ۳۱ ۔ ھود ۱۲ ۔ انعام ۵۳

۷ احقاف ۱۱

اسلامی انقلاب

مولانا وحید الدین خان، مدیر الرسالہ

حضرت آدم پہلے انسان تھے اور اسی کے ساتھ پہلے پیغمبر بھی۔ بعض روایات کے مطابق حضرت آدم کے بعد تقریباً ایک ہزار سال تک آپ کی نسل توحید اور دین حق پر قائم رہی۔ اس کے بعد ملت آدم میں شرک کا غلبہ ہوگیا (البقرہ ۲۱۳) حضرت نوح اسی ملت آدم کی اصلاح کے لئے آئے جو اس وقت دجلہ اور فرات کے سرسبز علاقہ میں آباد تھی۔

تاہم حضرت نوح کی طویل کوششوں کے باوجود ملت آدم دوبارہ مشرکانہ دین کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ ان میں سے صرف چند آدمی تھے جو حضرت نوح پر ایمان لائے۔ چنانچہ عظیم طوفان آیا اور چند مومنین کو چھوڑ کر باقی تمام لوگ غرق کر دئے گئے۔ اس کے بعد ملت نوح کے ذریعہ دوبارہ انسانی نسل چلی۔ لیکن دوبارہ وہی قصہ پیش آیا جو اس سے پہلے پیش آچکا تھا۔ کچھ عرصہ بعد بیشتر لوگ دین توحید کو چھوڑ کر دین شرک پر چل پڑے۔ یہی قصہ ہزاروں سال تک بار بار پیش آتا رہا۔ خدا نے لگاتار پیغمبر بھیجے (المومنون ۴۴) مگر انسان ان سے نصیحت قبول کرنے پر تیار نہ ہوا۔ حتی کہ تمام پیغمبروں کو استہزاء کا موضوع بنالیا گیا (یٰسین ۳۰)

یہ سلسلہ ہزاروں برس تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ تاریخ میں شرک کا تسلسل قائم ہوگیا۔ اس زمانہ کے انسانی معاشروں میں جو شخص بھی پیدا ہوتا وہ اپنے ماحول کی ہر چیز سے شرک کا سبق لیتا۔ مذہبی رسموں، سماجی تقریبات قومی میلے اور حکومتی نظام تک ہر چیز مشرکانہ عقائد پر قائم ہوگئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو انسان بھی پیدا ہو وہ شرک کی فضا میں آنکھ کھولے اور شرک ہی کے ماحول میں اس کا خاتمہ ہو جائے۔ اسی چیز کو میں نے تاریخ میں شرک کا تسلسل قائم ہوجانے سے تعبیر کیا ہے، اور یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت نوح کی دعا میں ان الفاظ میں ملتی ہے: **ولا یلدوا الا فاجراً کفاراً** (نوح ۲۷)

اب تاریخ حضرت ابراہیم تک پہنچ چکی تھی جن کا زمانہ ۲۱۰۰ قبل مسیح ہے۔ خود حضرت ابراہیم نے قدیم عراق میں جو اصلاحی کوششیں کیں ان کا بھی وہی انجام ہوا جو آپ سے پہلے دوسرے نبیوں کا ہوا تھا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لئے نیا منصوبہ بنایا۔ وہ منصوبہ یہ تھا کہ خصوصی اہتمام کے ذریعہ ایک ایسی نسل تیار کی جائے جو شرک کے تسلسل سے منقطع ہوکر پرورش پائے۔ اپنی فطری حالت پر قائم رہنے کی وجہ سے اس کے لئے توحید کو قبول کرنا آسان ہو جائے۔ پھر اسی گروہ کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا جائے کہ وہ تاریخ میں جاری ہونے والے شرک کے تسلسل کو توڑے۔

اس وقت حضرت ابراہیم کو حکم ہوا کہ وہ عراق اور شام اور مصر اور فلسطین جیسے آباد علاقوں کو چھوڑ کر

قدیم مکہ کے غیر آباد علاقہ میں جائیں۔ اور وہاں اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے شیر خوار بچے اسماعیل کو بسا دیں۔ یہ علاقہ وادیٔ غیر ذی زرع ہونے کی وجہ سے اس زمانہ میں بالکل غیر آباد تھا۔ اس بنا پر وہ قدیم مشرکانہ تہذیب سے پوری طرح پاک تھا۔ حضرت ابراہیم کی دعا (ابراہیم ۳۷) میں عند بیتك المحرم سے یہی چیز مراد ہے۔ یعنی ایک ایسا مقام جو شرک کی پہنچ سے دور ہو۔ حضرت ابراہیم کی اس دعا کا مطلب یہ تھا کہ خدایا، میں نے اپنی اولاد کو ایک بالکل غیر آباد علاقہ میں بسا دیا ہے۔ جہاں مشرکانہ تہذیبوں کے اثرات ابھی تک نہیں پہنچے ہیں۔ ایسا میں نے اس لئے کیا ہے تاکہ وہاں ایک ایسی نسل پیدا ہو جو شرک کے تسلسل سے منقطع ہو کر پرورش پائے اور حقیقی معنوں میں توحید کی پرستار بن سکے۔

کسی تہذیبی تسلسل سے منقطع ہو کر پرورش پانا کیا معنی رکھتا ہے، اس کی وضاحت ایک جزئی مثال سے ہو ہوتی ہے، راقم الحروف ایک ایسے علاقہ کا رہنے والا ہے جس کی زبان اردو ہے۔ میرے باپ اردو بولتے تھے۔ میں بھی اردو بولتا ہوں اور میرے بچوں کی زبان بھی اردو ہے۔ اب یہ ہوا کہ میرے ایک لڑکے نے لندن میں ایک ایسے علاقہ میں رہائش اختیار کر لی جہاں صرف انگریزی بولنے والے لوگ رہتے ہیں اور ہر طرف انگریزی زبان کا ماحول ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے اس لڑکے کے بچے اب صرف انگریزی زبان جانتے ہیں۔ وہ اردو میں اظہار خیال کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ میں لندن گیا تو اپنے ان پوتوں سے مجھے انگریزی زبان میں بات کرنی پڑی۔

میرے ان پوتوں کا بہ حال اس لئے ہوا کہ اردو کے تسلسل سے منقطع ہو کر ان کی پرورش ہوئی۔ اگر وہ میرے ساتھ دہلی میں ہوتے تو ان بچوں کا یہ معاملہ کبھی نہ ہوتا۔

ذبح اسماعیل کے واقعہ کی حقیقت بھی یہی ہے۔ حضرت ابراہیم کو جو خواب (الصافات ۱۰۲) دکھایا گیا وہ ایک تمثیلی خواب تھا۔ اگرچہ حضرت ابراہیم اپنی انتہائی وفاداری کی بنا پر اس کی حقیقی تعمیل کے لئے آمادہ ہو گئے۔ قدیم مکہ میں نہ پانی تھا، نہ سبزہ اور نہ زندگی کا کوئی سامان۔ ایسی حالت میں اپنی اولاد کو وہاں بسانا یقیناً ان کو ذبح کرنے کے ہم معنی تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ان کو جیتے جی موت کے حوالے کر دیا جائے۔ شرک کے تسلسل سے منقطع کر کے نئی نسل پیدا کرنے کا منصوبہ کسی ایسے مقام پر ہی زیر عمل لایا جا سکتا تھا جہاں اسباب حیات نہ ہوں اور اس بنا پر وہ انسانی آبادی سے خالی ہو۔ حضرت ابراہیم کے خواب کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی اولاد کو معاشی اور سماجی حیثیت سے ذبح کر کے مذکورہ نسل تیار کرنے میں خدائی منصوبہ کا ساتھ دیں۔

یہ منصوبہ چوں کہ اسباب کے دائرہ میں زیر عمل لانا تھا اس لئے اس کی باقاعدہ نگرانی بھی ہوتی رہی۔ حضرت ابراہیم خود فلسطین میں مقیم تھے۔ مگر وہ کبھی کبھی اس کی جانچ کے لئے مکہ جاتے رہتے تھے۔

ابتداءً اس مقام پر صرف ہاجرہ اور اسماعیل تھے۔ بعد کو جب وہاں زمزم کا پانی نکل آیا تو قبیلہ جرہم کے

کچھ خانہ بدوش افراد یہاں آکر آباد ہو گئے۔ حضرت اسماعیل بڑے ہوئے تو انھوں نے قبیلہ جرہم کی ایک لڑکی سے شادی کرلی۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیم ایک بار فلسطین سے چل کر مکہ پہنچے تو اس وقت حضرت اسماعیل گھر پر موجود نہ تھے۔ حضرت ابراہیم نے ان کی بیوی سے حال دریافت کیا۔ بیوی نے کہا کہ ہم بہت برے حال میں ہیں، اور زندگی مصیبتوں میں گزر رہی ہے۔ حضرت ابراہیم یہ کہہ کر واپس ہو گئے کہ جب اسماعیل آئیں تو ان کو میرا سلام کہنا اور یہ کہنا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ بدل دو (غیّر عتبۃ بابك) حضرت اسماعیل جب لوٹے اور بیوی سے یہ روداد سنی تو وہ سمجھ گئے کہ یہ میرے والد تھے اور ان کا یہ پیغام تمثیل کی زبان میں یہ ہے کہ میں موجودہ عورت کو چھوڑ کر دوسری عورت سے رشتہ کرلوں۔ چنانچہ انھوں نے اس کو طلاق دے دی اور قبیلہ کی دوسری عورت سے شادی کرلی۔ حضرت ابراہیم کی نظر میں وہ عورت اس قابل نہ تھی کہ وہ زیر تیاری نسل کی ماں بن سکے۔

کچھ عرصہ بعد حضرت ابراہیم دوبارہ مکہ آئے۔ اب بھی حضرت اسماعیل گھر پر نہ تھے۔ البتہ ان کی دوسری بیوی وہاں موجود تھیں۔ اس سے حال پوچھا تو اس نے قناعت اور شکر کی باتیں کیں اور کہا کہ ہم بہت اچھے حال میں ہیں۔ حضرت ابراہیم یہ کہہ کر واپس ہو گئے کہ جب اسماعیل آئیں تو ان سے میرا سلام کہنا اور یہ پیغام دے دینا کہ اپنے گھر کی چوکھٹ باقی رکھو (ثبت عتبۃ بابك) حضرت اسماعیل جب واپس آئے اور روداد سنی تو سمجھ گئے کہ یہ سسرے والد تھے اور ان کے پیغام کا مطلب یہ ہے کہ اس عورت کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ پیش نظر منصوبہ سے مطابقت کرکے رہ سکے اور پھر اس سے وہ نسل تیار ہو جس کا یہاں تیار کرنا اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے (تفسیر ابن کثیر)

اس طرح صحرائے عرب کے الگ تھلگ ماحول میں ایک نسل بننا شروع ہوئی۔ اس نسل کی خصوصیات کیا تھیں، اس کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نسل بیک وقت دو خصوصیات کی حامل تھی۔ ایک الفطرۃ اور دوسرے المرورۃ۔

صحرائے عرب کے ماحول میں فطرت کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی جو انسان کو متاثر کرے۔ کھلے بیابان، اونچے پہاڑ، رات کے وقت وسیع آسمان میں جگمگاتے ہوئے تارے وغیرہ۔ اس قسم کے قدرتی مناظر چاروں طرف سے انسان کو توحید کا سبق دے رہے تھے۔ وہ ہر وقت اس کو خدا کی عظمت اور کارگیری کی یاد دلاتے تھے۔ اسی خالص ربانی ماحول میں پرورش پاکر وہ قوم تیار ہوئی جو حضرت ابراہیم کے الفاظ میں اس بات کی صلاحیت رکھتی تھی کہ وہ حقیقی معنوں میں امت مسلمہ (البقرہ ۱۲۸) بن سکے۔ یعنی اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے سپرد کر دینے والی قوم۔ یہ ایک ایسی قوم تھی جس کی فطرت اپنی ابتدائی حالت میں محفوظ تھی، اسی لئے وہ دین فطرت کو قبول کرنے کی پوری استعداد رکھتی تھی۔

اسی کے ساتھ دوسری چیز جس کو پیدا کرنے کے لئے یہ ماحول خصوصی طور پر موزوں تھا وہ وہی ہے

جس عربی زبان میں المروۃ (مردانگی) کہتے ہیں۔ قدیم حجاز کے سنگلاخ ماحول میں زندگی نہایت مشکل تھی۔ وہاں خارجی اسباب سے زیادہ انسانی اوصاف کارآمد ہوسکتے تھے۔ وہاں بیرونی ماحول میں وہ چیزیں موجود نہ تھیں جن پر انسان بھروسہ کرتا ہے۔ وہاں انسان کے پاس ایک ہی چیز تھی، اور وہ اس کا اپنا وجود تھا۔ ایسے ماحول میں قدرتی طور پر ایسا ہونا تھا کہ انسان کے اندرونی اوصاف زیادہ سے زیادہ اجاگر ہوں۔ اس طرح دو ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں وہ قوم بن کر تیار ہوئی جس کے اندر حیرت انگیز طور پر اعلیٰ مردانہ اوصاف تھے۔ پروفیسر فلپ ہٹی کے الفاظ میں پورا عرب ہیروؤں کی ایک ایسی نرسری (Nursery of heroes) میں تبدیل ہوگیا جس کی مثال نہ اس سے پہلے تاریخ میں کبھی پائی گئی اور نہ اس کے بعد۔

چھٹی صدی عیسوی میں وہ وقت آگیا تھا کہ تاریخ میں شرک کے تسلسل کو توڑنے کا منصوبہ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ چنانچہ بنو اسماعیل کے اندر پیغمبر آخر الزماں (حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم) پیدا کردیے گئے۔ جن کے بارہ میں قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: ھوالذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولوکرہ الکافرون (الصف) یہ آیت بتاتی ہے کہ پیغمبر آخر الزماں کا خاص مشن یہ تھا کہ دین شرک کو غلبہ کے مقام سے ہٹادیں اور دین توحید کو غالب دین کی حیثیت سے دنیا میں قائم کردیں۔ اس غلبہ سے مراد اصلاً فکری اور نظریاتی غلبہ ہے۔ یعنی تقریباً اسی قسم کا غلبہ جیسا کہ موجودہ زمانہ میں سائنسی علوم کو روایتی علوم کے اوپر حاصل ہوا ہے۔

یہ غلبہ تاریخ کا مشکل ترین منصوبہ تھا۔ اس کا کچھ اندازہ اس مثال سے ہوسکتا ہے کہ قدیم روایتی علوم کو اگر جدید سائنسی علوم پر غالب کرنے کی مہم چلائی جائے تو وہ کس قدر دشوار ہوگی۔ اسی طرح ساتویں صدی عیسوی میں یہ بے حد مشکل کام تھا کہ مشرکانہ تہذیب کو مغلوب کیا جائے اور اس کی جگہ توحید کو غالب فکر کا مقام عطا کیا جائے۔ کسی نظام کے فکری غلبہ کو ختم کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی درخت کو اس کی تمام جڑوں سمیت اکھاڑ پھینکنا۔ اس قسم کا کام ہمیشہ بے حد مشکل کام ہوتا ہے جو نہایت گہری منصوبہ بندی اور زبردست جد وجہد کے بعد ہی انجام دیا جاسکتا ہے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے پیغمبر آخر الزماں صلے اللہ علیہ وسلم کو دو خاص امدادی چیزیں فراہم کی گئیں۔ ایک وہ جس کا ذکر کنتم خیر امۃ اخرجت للناس (آل عمران - ۱۱۰) میں ہے۔ دو ہزار سال کے عمل کے نتیجہ میں ایک ایسا گروہ تیار کیا گیا جو وقت کا بہترین گروہ تھا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، ایک طرف وہ اپنی تخلیقی فطرت پر قائم تھا۔ دوسری طرف وہ چیز اس کے اندر کمال درجہ میں موجود تھی جس کو عربی زبان میں المروۃ (مردانگی) کہا جاتا ہے۔ اسی گروہ کے بہترین منتخب افراد، قبول اسلام کے بعد وہ لوگ بنے جن کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔

دوسری خصوصی مدد وہ تھی جس کی طرف سورۃ الروم کی ابتدائی آیات میں اشارہ ملتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت دنیا میں دو بڑی مشرکانہ سلطنتیں تھیں۔ ایک رومی (بازنطینی) سلطنت، دوسرے ایرانی (ساسانی) سلطنت۔ اس وقت کی آباد دنیا کا اکثر حصہ، براہ راست یا بالواسطہ طور پر، انھیں دونوں سلطنتوں کے زیر قبضہ تھا۔ توحید کو وسیع تر دنیا میں غالب کرنے کے لئے ان دونوں مشرک سلطنتوں سے سابقہ پیش آنا لازمی تھا۔ خدا نے یہ کیا کہ عین اسی زمانہ میں دونوں سلطنتوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا دیا۔ ان کی یہ لڑائی نسلوں تک جاری رہی۔ ایک بار ایرانی اٹھے اور رومیوں کی طاقت کو تہس نہس کر کے ان کی مملکت کے بڑے حصہ پر قابض ہو گئے۔ دوسری بار رومی اٹھے اور انھوں نے ایرانیوں کی طاقت کو بالکل توڑ ڈالا۔ یہی وجہ ہے کہ بنو اسماعیل (اصحاب رسول) جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے تحت منظم ہو کر اٹھے تو انھوں نے بے حد کم عرصہ میں ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصہ کو فتح کر ڈالا اور ہر طرف شرک کو مغلوب اور توحید کو غالب کر دیا۔

اس سلسلے میں یہاں پروفیسر ہٹی کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے:

The enfeebled conditions of the rival Byzantines and Sasanids who had conducted internecine wars against each other for many generations,, the heavy taxes, consequent upon these wars, imposed on the citizens of both empires and undermining their sense of loyalty.. - - - all these paved the way for the surprisingly rapid progress of Arabian arms.

Philip K. Hitti, History of the Arabs, London 1970, P. 142-43

رومی اور ایرانی سلطنتوں کی باہمی رقابت نے دونوں کو شدید طور پر کمزور کر دیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف ہلاکت خیز جنگیں چھیڑ رکھی تھیں۔ یہ سلسلہ کئی نسل تک جاری رہا۔ اس کا خرچ پورا کرنے کے لئے رعایا پر بھاری ٹیکس لگائے گئے۔ جس کے نتیجے میں رعایا کی وفاداری اپنی حکومتوں کے ساتھ باقی نہ رہی۔ اس قسم کی چیزیں تھیں جنھوں نے عرب ہتھیاروں کو موقع دیا کہ وہ رومی اور ایرانی علاقوں میں تعجب خیز حد تک تیز کامیابی حاصل کر سکیں۔

مورخین نے عام طور پر اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ تاہم وہ اس کو ایک عام طبیعی واقعہ سمجھتے ہیں حالانکہ یہ غیر معمولی واقعہ ایک خدائی منصوبہ تھا جو خاتم النبیین کی تائید کے لئے خصوصی طور پر ظاہر کیا گیا۔

ایک امریکی انسائیکلوپیڈیا میں "اسلام" کے عنوان سے جو مقالہ ہے اس میں عیسائی مقالہ نگار نے یہ الفاظ لکھے ہیں کہ اسلام کے ظہور نے انسانی تاریخ کے رخ کو بدل دیا:

Its advent changed the course of human history

یہ ایک حقیقت ہے کہ صدر اول کے اسلامی انقلاب کے بعد انسانی تاریخ میں ایسی تبدیلیاں ہوئیں جو اس سے پہلے تاریخ میں کبھی نہیں ہوئی تھیں۔ اور ان تمام تبدیلیوں کی اصل یہ تھی کہ دنیا میں

شرک کا تسلسل ختم ہو کر توحید کا تسلسل جاری ہوا۔ شرک تمام برائیوں کی جڑ ہے اور توحید تمام خوبیوں کا سرچشمہ ہے۔ اس لئے جب یہ بنیادی واقعہ ہوا تو اسی کے ساتھ انسان کے اوپر تمام خوبیوں کا دروازہ بھی کھل گیا جو شرک کے غلبہ کے سبب سے اب تک اس کے اوپر بند پڑا ہوا تھا۔

اب توہماتی دور ختم ہو کر علمی دور کا آغاز ہوا۔ انسانی امتیاز کی بنیاد ڈھ گئی اور اس کے بجائے انسانی مساوات کا زمانہ شروع ہوا۔ نسلی حکمرانی کی جگہ جمہوری حکمرانی کی بنیادیں پڑیں۔ مظاہر فطرت جو تمام دنیا میں پرستش کا موضوع بنے ہوئے تھے، پہلی بار تحقیق اور تسخیر کا موضوع قرار پائے، اور اس طرح حقائق فطرت کے کھلنے کا آغاز ہوا۔ یہ دراصل توحید ہی کا انقلاب تھا جس سے ان تمام انقلابات کی بنیاد پڑی جو بالآخر اس مشہور واقعہ کو پیدا کرنے کا سبب بنے جس کو جدید ترقی یافتہ دور کہا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم نے دعا فرمائی تھی کہ خدایا مجھ کو اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بتوں کی عبادت کریں۔ خدایا، ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا (ابراہیم ۳۶)

سوال یہ ہے کہ بتوں نے کس طرح لوگوں کو گمراہ کیا۔ بتوں (اصنام) میں وہ کون سی خصوصیت تھی جس کی بنا پر وہ لوگوں کو گمراہ کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس کا راز اس وقت سمجھ میں آتا ہے جب یہ دیکھا جائے کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں وہ کون سے بت تھے جن کی بابت آپ نے یہ الفاظ فرمائے۔

یہ بت سورج، چاند اور ستارے تھے۔ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں جو مہذب دنیا تھی اس میں ہر جگہ آسمان کے ان روشن اجرام کی پرستش ہوتی تھی جن کو سورج، چاند اور ستارے کہا جاتا ہے۔ اسی سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ بت کیوں کر لوگوں کو گمراہ کر پاتے تھے۔

خدا اگرچہ سب سے بڑی حقیقت ہے مگر وہ آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے برعکس سورج، چاند اور ستارے ہر آنکھ کو جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی جگمگاہٹ کی بنا پر لوگ ان کے فریب میں آ گئے اور ان سے متاثر ہو کر ان کو پوجنا شروع کر دیا۔ ان روشن اجسام کا غلبہ انسان کے ذہن پر اتنا زیادہ ہوا کہ وہی پوری انسانی فکر پر چھا گیا۔ حتی کہ حکومتیں بھی انھیں کی بنیاد پر قائم ہونے لگیں۔ اس زمانہ کے بادشاہ اپنے آپ کو سورج کی اولاد اور چاند کی اولاد بتا کر لوگوں کے اوپر حکومت کرنے لگے۔

پیغمبر آخر الزماں کے ذریعہ توحید کو غالب کر کے اس دور کو ختم کیا گیا۔ اس وقت غلبۂ توحید کا جو منصوبہ بنایا گیا اس کے دو خاص مرحلے تھے۔ پہلا مرحلہ وہ تھا جس کو قرآن میں قاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ و یکون الدین کلہ للہ (الانفال ۳۹) کہا گیا ہے۔ اس آیت میں "فتنہ" سے مراد شرک جارح ہے۔ قدیم زمانہ میں شرک کو جارحیت کا موقع اس لئے حاصل تھا کہ اس زمانہ میں حکومت کی بنیاد شرک پر قائم ہو گئی تھی۔ شرک و عمل طور پر حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ ایسی حالت میں جب توحید کی دعوت دی جاتی تو وقت کے حکمرانوں کو یہ محسوس ہونے لگتا کہ یہ دعوت ان کے حق حکمرانی کو مشتبہ کر رہی ہے۔ چنانچہ وہ توحید کے داعیوں

کو کچلنے کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ قدیم زمانہ میں اعتقادی جارحیت کا اصل سبب یہی تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو یہ حکم ہوا کہ علم برداران شرک سے لڑو اور شرک کی اس حیثیت کا خاتمہ کر دو کہ وہ داعیان توحید کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنا سکیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ تھا کہ شرک کا رشتہ سیاست سے کاٹ دیا جائے۔ شرک اور سیاست دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ رسول اور آپ کے اصحاب نے یہ مہم پوری طاقت کے ساتھ شروع کی۔ ان کی کوششوں سے پہلے عرب میں شرک کا زور ٹوٹا۔ اس کے بعد قدیم آباد دنیا کے بیشتر علاقہ میں مشرکانہ نظام کو مغلوب کر کے ہمیشہ کے لئے شرک کی جارحانہ حیثیت کا خاتمہ کر دیا گیا اب ہمیشہ کے لئے شرک الگ ہو گیا اور سیاسی اقتدار الگ۔

شرک کے اوپر توحید کے غلبہ کی مہم کا دوسرا مرحلہ وہ تھا جس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ملتا ہے:
سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتی یتبین لھم انہ الحق (حم السجدہ ۵۳) پہلے مرحلہ کا مطلب مظاہر فطرت سے سیاسی نظریہ اخذ کرنے کو ختم کرنا تھا۔ وہ ساتویں صدی عیسوی میں پوری طرح انجام پا گیا۔ دوسرے مرحلہ کا مطلب یہ تھا کہ مظاہر فطرت سے توہمات کے پردہ کو ہٹا دیا جائے اور اس کو علم کی روشنی میں لایا جائے۔ اس دوسرے مرحلہ کا آغاز دور نبوت سے ہوا اور اس کے بعد وہ موجودہ سائنسی انقلاب کی صورت میں تکمیل کو پہنچا۔

موجودہ دنیا خدا کی صفات [illegible] ہے۔ یہاں مخلوقات کے آئینہ میں آدمی اس کے خالق کو پاتا ہے۔ وہ اس پر غور کر کے [illegible] ہے۔ مگر قدیم مشرکانہ افکار نے دنیا کی چیزوں کو پر اسرار طور پر مقدس بنا رکھا تھا۔ ہر چیز کے بارے میں کچھ توہماتی عقائد بن گئے تھے اور یہ عقائد ان چیزوں کی تحقیق وجستجو میں مانع تھے۔ توحید کے انقلاب کے بعد جب تمام دنیا خدا کی مخلوق قرار پائی تو اس کے بارہ میں تقدس کا ذہن ختم ہو گیا۔ اب دنیا کی ہر چیز کا بے لاگ مطالعہ کیا جانے لگا اور اس کی تحقیق شروع ہو گئی۔

اس تحقیق اور مطالعہ کے نتیجہ میں چیزوں کی حقیقتیں کھلنے لگیں۔ دنیا کے اندر قدرت کا جو مخفی نظام کارفرما ہے وہ انسان کے سامنے آنے لگا۔ یہاں تک کہ جدید سائنسی انقلاب کی صورت میں وہ پیشین گوئی کامل صورت میں پوری ہو گئی جس کا ذکر اوپر کی آیت (حم السجدہ ۵۳) میں ہے۔

جدید سائنسی مطالعہ نے کائنات کے جو حقائق انسان پر کھولے ہیں انھوں نے ہمیشہ کے لئے توہماتی دور کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ان دریافت شدہ حقائق سے بیک وقت دو فائدے حاصل ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ دینی عقائد اب محض مدعیانہ عقائد نہیں رہے بلکہ خود علم انسانی کے ذریعہ ان کا برحق ہونا ایک ثابت شدہ چیز بن گیا ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ معلومات ایک مومن کے لئے اضافۂ ایمان کا بے پناہ خزانہ ہیں۔ ان کے ذریعہ کائنات کے بارہ میں جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ اگرچہ بہت جزئی ہے تاہم وہ اتنا زیادہ حیرت ناک ہے کہ اس کو پڑھ کر اور جان کر آدمی کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوں۔ اس کا ذہن معرفت رب کی روشنی حاصل کرے۔ اس کی آنکھیں خدا کی عظمت اور خوف سے آنسو بہانے لگیں۔ وہ آدمی کو اس درجۂ احسان تک پہنچا دے جس کو حدیث میں تعبد اللہ کانک تراہ (اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو) کہا گیا ہے۔

دور جدید میں احیار اسلام

موجودہ زمانہ میں تاریخ دوبارہ وہیں پہنچ گئی ہے جہاں وہ ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے دور میں پہنچی تھی۔ قدیم زمانہ میں انسان کے اوپر شرک کا غلبہ اس طرح ہوا کہ تاریخ میں اس کا تسلسل قائم ہو گیا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر شخص جو انسانی نسل میں پیدا ہوتا وہ مشرک پیدا ہوتا۔ اب پچھلے چند سو سال کے عمل کے نتیجہ میں ملحدانہ افکار انسان کے اوپر غالب آ گئے ہیں۔ علم و عمل کے ہر شعبہ میں الحادی طرز فکر اس طرح چھا گیا ہے کہ دوبارہ تاریخ انسانی میں الحاد کا تسلسل قائم ہو گیا ہے۔ اب ہر شخص جو پیدا ہوتا ہے، خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ میں پیدا ہو، وہ ملحدانہ افکار کے زیر اثر پیدا ہوتا ہے۔ الحاد آج کا غالب دین ہے۔ اور اسلام کا احیار موجودہ زمانہ میں اس وقت تک ممکن نہیں جب تک الحاد کو فکری غلبہ کے مقام سے ہٹایا نہ جائے۔

موجودہ زمانہ میں احیار اسلام کو ممکن بنانے کے لئے دوبارہ وہی دونوں طریقے اختیار کرنے ہیں جو پہلے غلبہ کے وقت اختیار کئے گئے تھے۔ یعنی افراد کی تیاری۔ اور مخالفین حق کی مغلوبیت۔

پہلا کام ہم کو خود اپنے وسائل کے تحت انجام دینا ہے۔ جہاں تک دوسرے کام کا تعلق ہے، اس کو موجودہ زمانہ میں دوبارہ خدا نے اسی طرح بہت بڑے پیمانہ پر انجام دے دیا ہے جس طرح اس نے دور اول میں انجام دیا تھا۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ان پیدا شدہ مواقع کو استعمال کیا جائے۔

۱۔ موجودہ زمانہ میں احیار اسلام کی مہم کو کامیاب بنانے کے لئے سب سے پہلے افراد کار کی ضرورت ہے۔ گویا اب دوبارہ ایک نئے انداز سے وہی چیز درکار ہے جو حضرت ابراہیم کے منصوبہ میں مطلوب تھی۔ یعنی حقیقی معنوں میں ایک مسلم گروہ کی تیاری۔

موجودہ زمانہ میں اسلامی احیار کی مہم چلانے کے لئے جو افراد درکار ہیں وہ عام قسم کے مسلمان نہیں ہیں بلکہ ایسے لوگ ہیں جن کے لئے اسلام ایک دریافت (Discovery) بن گیا ہو۔ وہ واقعہ جو سب سے زیادہ کسی انسان کو متحرک کرتا ہے وہ یہی دریافت کا واقعہ ہے۔ جب آدمی کسی چیز کو دریافت کے درجہ میں پائے تو اچانک اس کے اندر ایک نئی شخصیت ابھر آتی ہے۔ یقین، حوصلہ، عزم، مردانگی، فیاضی، قربانی، اتحاد، غرض وہ تمام اوصاف جو کوئی بڑا کام کرنے کے لئے درکار ہیں وہ سب دریافت کی زمین پر پیدا ہوتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں مغربی اقوام میں جو اعلیٰ اوصاف پائے جاتے ہیں وہ سب اسی دریافت کا ثمرہ ہیں۔

مغربی قوموں نے روایتی دنیا کے مقابلہ میں سائنسی دنیا کو دریافت کیا ہے۔ یہی دریافت کا احساس ہے جس نے مغربی قوموں میں وہ اعلیٰ اوصاف پیدا کر دئے ہیں جو آج ان کے اندر پائے جاتے ہیں۔

قرن اول میں اصحاب رسول کا معاملہ بھی یہی تھا۔ ان کو خدا کا دین بطور دریافت کے ملا تھا۔ انھوں نے جاہلیت کے مقابلہ میں اسلام کو پایا تھا۔ انھوں نے شرک کے مقابلہ میں توحید کو دریافت کیا تھا۔ ان پر دنیا کے مقابلہ میں آخرت کا انکشاف ہوا تھا۔ یہی چیز تھی جس نے ان کے اندر وہ غیر معمولی اوصاف پیدا کر دئے جن کو آج ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ آج اگر اسلامی احیار کی مہم کو موثر طور پر چلانا ہے تو دوبارہ ایسے انسان پیدا کرنے ہوں گے جنھیں اسلام دریافت کے طور پر ملا ہو نہ کہ محض نسلی وراثت کے طور پر۔

۲۔ اسلام چودہ سو سال پہلے شروع ہوا۔ اس کے بعد اس کی ایک تاریخ بنی، تمدنی عظمت اور سیاسی فتوحات کی تاریخ۔ آج جو لوگ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں وہ اسی تاریخ کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں۔ جس قوم کی بھی یہ صورت حال ہو وہ ہمیشہ قریبی تاریخ میں اٹک کر رہ جاتی ہے۔ وہ تاریخ سے گذر کر ابتدائی اصل تک نہیں پہنچتی۔ یہی معاملہ آج مسلمانوں کا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان شعوری یا غیر شعوری طور پر، اپنا دین تاریخ سے اخذ کر رہے ہیں نہ کہ حقیقۃً قرآن اور سنت رسول سے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام آج کے مسلمانوں کے لئے فخر کی چیز بنا ہوا ہے نہ کہ ذمہ داری کی چیز۔ ان کے افکار و اعمال میں یہ نفسیات اس قدر رچ بس گئی ہے کہ ہر جگہ اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کو قرآن وسنت میں دیکھئے تو وہ سراسر ذمہ داری اور مسئولیت کی چیز نظر آئے گا۔ اس کے برعکس اسلام کو جب اس کی تمدنی تاریخ اور سیاسی واقعات کے آئینہ میں دیکھا جائے تو وہ فخر اور عظمت کی چیز معلوم ہونے لگتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام بڑی بڑی انقلابی تحریکیں اسی جذبہ فخر کے تحت اٹھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ وقتی ہنگامے پیدا کر کے ختم ہو گئیں۔ کیوں کہ فخر کا جذبہ نمائش اور ہنگامے کی طرف لے جاتا ہے۔ اور مسئولیت کا جذبہ حقیقی اور سنجیدہ عمل کی طرف۔

اسلامی احیار کی مہم کو موثر طور پر چلانے کے لئے وہ افراد درکار ہیں جنھوں نے اسلام کو قرآن و حدیث کی ابتدائی تعلیمات سے اخذ کیا ہو نہ کہ بعد کو بننے والی تمدنی اور سیاسی تاریخ سے۔ قرآن و حدیث سے دین کو اخذ کرنے والے لوگ ہی سنجیدگی اور احساس ذمہ داری کے تحت کوئی حقیقی مہم چلا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ تاریخ سے اپنا دین اخذ کریں وہ صرف اپنے فخر کا جھنڈا بلند کریں گے، وہ کسی نتیجہ خیز عمل کا ثبوت نہیں دے سکتے۔

مسلمان موجودہ زمانہ میں ایک شکست خوردہ قوم بنے ہوئے ہیں۔ پوری مسلم دنیا پر ایک قسم کا احساس مظلومی (Persecution complex) چھایا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہی تاریخ سے دین کو اخذ کرنا ہے۔ ہم نے تاریخی عظمت کو دین سمجھا۔ ہم نے "لال قلعہ" اور "فتح پور سیکری" میں اپنی اسلامیت کا

تشخص دریافت کیا۔ چوں کہ موجودہ زمانہ میں دوسری قوموں نے ہم سے یہ چیزیں چھین لیں، اس لئے ہم فریاد و ماتم میں مشغول ہو گئے۔ اگر ہم ہدایت ربانی کو دین سمجھتے تو ہم کبھی احساس محرومی کا شکار نہ ہوتے۔ کیوں کہ وہ ایسی چیز ہے جس کو کوئی طاقت ہم سے کبھی چھین نہیں سکتی۔ ہم نے چھن جانے والی چیزوں کو اسلام سمجھا اس لئے جب وہ چھن گئی تو ہم شکایت اور محرومی کا پیکر بن کر رہ گئے۔ اگر ہم نہ چھننے والی چیز کو اسلام سمجھتے تو ہمارا کبھی وہ حال نہ ہوتا جو آج ہر طرف نظر آرہا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ جو چیز ہمارے پاس ابھی تک بغیر چھنی ہوئی محفوظ ہے اس کا ہمیں شعور نہیں۔ اور جو چیز ہم سے چھن گئی ہے اس کے لئے ہم شکایت اور احتجاج میں مصروف ہیں۔

اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان دوسری قوموں سے لڑائی جھگڑے میں مصروف ہیں۔ وہ اسلام کو اپنی قومی عظمت کا نشان سمجھتے ہیں۔ اس لئے جو لوگ انھیں اس عظمت کو چھینتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کے خلاف وہ لڑنے کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں۔ کہیں یہ لڑائی الفاظ کے ذریعہ ہو رہی ہے اور کہیں ہتھیاروں کے ذریعہ۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کے پورے رویہ کو منفی بنا دیا ہے۔ اسلام اگر ان کو ربانی ہدایت کے طور پر ملتا تو وہ محسوس کرتے کہ ان کے پاس دوسری قوموں کو دینے کے لئے کوئی چیز ہے۔ وہ اپنے کو دینے والا سمجھتے اور دوسرے کو لینے والا۔ جب کہ موجودہ حالت میں وہ سمجھتے ہیں کہ وہ چھنے ہوئے لوگ ہیں اور دوسرے چھیننے والے لوگ۔ ہمارے اور دوسری قوموں کے درمیان حقیقی رشتہ داعی اور مدعو کا رشتہ ہے۔ مگر تاریخی اسلام کو اسلام سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دوسری قومیں ہمارے لئے صرف حریف اور رقیب بن کر رہ گئی ہیں۔ ہمارے اور دوسری قوموں کے درمیان جب تک یہ حریفانہ فضا باقی ہے، اسلامی احیاء کا کوئی حقیقی کام شروع نہیں کیا جا سکتا۔

پہلے ہی مرحلہ میں ایسا نہیں ہو سکتا کہ تمام مسلمانوں کو حریفانہ نفسیات سے پاک کر دیا جائے۔ مگر کم سے کم ایک ایسی ٹیم کا ہونا ضروری ہے جس کے افراد اپنی حد تک اس ذہنی فضا سے نکل چکے ہوں۔ جن کے اندر ایسی فکری تبدیلی آچکی ہو کہ دوسری قوموں کو وہ اپنا مدعو سمجھیں نہ کہ مادی حریف اور رقیب۔ یہ بظاہر سادہ سی بات انتہائی مشکل بات ہے۔ اس کے لئے اپنے آپ کو ذبح کرنا پڑتا ہے۔ اپنے اور دوسری قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم کرنے کی لازمی شرط یہ ہے کہ ہم یک طرفہ طور پر تمام شکایتوں کو بھلا دیں۔ ہر قسم کے مادی نقصانات کو گوارا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ داعی اور مدعو کا رشتہ داعی کی طرف سے یک طرفہ قربانی پر قائم ہوتا ہے۔ اور موجودہ دنیا میں بلاشبہ یہ سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔

یہ اور اس طرح کے دوسرے اوصاف ہیں جو ان لوگوں میں ہونا ضروری ہیں جو موجودہ زمانہ میں احیاء اسلام کی مہم کے لئے اٹھیں۔ ایسے افراد تیار کرنے کے لئے موجودہ زمانہ میں دوبارہ اسی قسم کا

ایک منصوبہ درکار ہے جو دور اول میں خیر امت کے اخراج (آل عمران ۔ ۱۱۰) کے لئے زیر عمل لایا گیا تھا۔ موجودہ زمانہ کے اعتبار سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج یہ ضرورت ہے کہ جدید طرز کی ایک اعلیٰ تربیت گاہ قائم کی جائے۔ یہ تربیت گاہ تمدنی ماحول سے الگ قدرت کی بے آمیز فضا میں قائم ہونی چاہیے۔ یہ تربیت گاہ گویا دوبارہ قوم کے کچھ اعلیٰ افراد کو وادیٔ غیر ذی زرع میں بسانے کے ہم معنی ہوگی۔

مذکورہ تربیت گاہ کو کامیاب طور پر چلانے کے لئے کچھ ایسے ابراہیمی والدین درکار ہیں جو اپنی اولاد کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہوں۔ وہ اس پر راضی ہو جائیں کہ ان کی ذہین اولاد کو وقت کے اعلیٰ معاشی مواقع سے محروم کر کے ایک ایسے ماحول میں ڈال دیا جائے جہاں سب کچھ دے کر بھی تعلق باللہ اور فکر آخرت کے سوا کوئی اور چیز نہ ملتی ہو۔ اس طرح کی ایک تربیت گاہ، فلپ ہٹی کے مذکورہ الفاظ میں، دوبارہ ایک قسم کی "نرسری آف ہیروز" بنانے کے ہم معنی ہوگی۔ جب تک اس قسم کے افراد کی ایک قابل لحاظ ٹیم تیار نہ ہو جائے، احیاء اسلام کی جانب کوئی حقیقی قدم نہیں اٹھایا جا سکتا۔

اس قسم کی تربیت گاہ کا قیام گویا جدید زمانہ کے لحاظ سے اس آیت قرآنی کی تعمیل ہوگی ——— ولولا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم لعلهم یرجعون۔ یعنی قوم کے کچھ ذہین افراد کو عام ماحول سے الگ کر کے ایک علیحدہ ماحول میں لایا جائے اور وہاں متعین مدت تک خصوصی تعلیم و تربیت کے ذریعہ انھیں اس کے لئے تیار کیا جائے کہ وہ موجودہ زمانہ میں احیاء اسلام کی مہم کو کامیابی کے ساتھ چلا سکیں۔ وہ اہل عالم کے لئے منذر اور مبشر بن سکیں۔

دور اول میں اسلامی انقلاب کو ممکن بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص اہتمام یہ کیا کہ ایران اور روم کی سلطنتیں جو اس زمانہ میں دین توحید کی سب سے بڑی حریف تھیں، ان کو باہم ٹکرا کر اتنا کمزور کر دیا کہ اہل اسلام کے لئے ان کو مغلوب کرنا آسان ہو گیا۔

خدا کی یہی مدد موجودہ زمانہ کے اہل ایمان کے لئے ایک اور شکل میں ظاہر ہوئی ہے۔ اور وہ ہے کائنات کے بارہ میں ایسی معلومات کا سامنے آنا جو دینی حقیقتوں کو معجزاتی سطح پر ثابت کر رہی ہیں۔ قدیم زمانہ میں تو ہماتی طرز فکر کا غلبہ تھا، اس بنا پر عالم کائنات کے بارہ میں انسان نے عجیب عجیب بے بنیاد رائیں قائم کر رکھی تھیں۔ کائنات کو قرآن میں آلاء رب (کرشمۂ خدا) کہا گیا ہے۔ مگر یہ خدائی کرشمہ توہماتی مفروضوں کے پردہ میں چھپا ہوا تھا۔ دور اول کے اسلامی انقلاب کے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ ہے کہ مظاہر فطرت جو اس سے پہلے پرستش کا موضوع بنے ہوئے تھے وہ انسان کے لئے تحقیق و تسخیر کا موضوع بن گئے۔ اس طرح تاریخ انسانی میں پہلی بار واقعاتِ فطرت کو خالص علمی انداز میں

جاننے کا ذہن پیدا ہوا۔ یہ ذہن مسلسل بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ یورپ پہنچا۔ یہاں ترقی پاکر وہ اس انقلاب کا سبب بنا جس کو موجودہ زمانہ میں سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔

سائنس نے گویا توہماتی پردہ کو ہٹا کر کرشمۂ خدا کا کرشمہ خدا ہونا ثابت کر دیا۔ اس نے مظاہر فطرت کو "معبود" کے مقام سے ہٹا کر "مخلوق" کے مقام پر رکھ دیا۔ حتی کہ یہ نوبت آئی کہ چاند جس کو قدیم انسان معبود سمجھ کر پوجتا تھا، اس پر اس نے اپنے پاؤں رکھ دئے اور وہاں اپنی مشینیں اتار دیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سائنس نے جو نئے دلائل فراہم کئے ہیں ان کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو دین توحید کی دعوت کو اس برتر سطح پر پیش کیا جا سکتا ہے جس کے لئے اس سے پہلے معجزات ظاہر کئے جاتے تھے۔

زمین و آسمان میں جو چیزیں ہیں وہ اس لئے ہیں کہ ان کو دیکھ کر آدمی خدا کو یاد کرے۔ مگر انسان نے خود انھیں چیزوں کو خدا سمجھ لیا۔ یہ ایک قسم کا انحراف تھا۔ اسی قسم کا انحراف موجودہ زمانہ میں سائنسی معلومات کے بارہ میں پیش آرہا ہے۔ سائنسی تحقیق سے جو حقائق سامنے آئے ہیں وہ سب خدا کی خدائی کا ثبوت ہیں۔ وہ انسان کو خدا کی یاد دلانے والے ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے ملحد مفکرین نے دوبارہ ایک انحراف کیا۔ انھوں نے سائنسی حقیقتوں کو غلط رخ دے کر یہ کیا کہ جس چیز سے خدا کا ثبوت نکل رہا تھا اس کو انھوں نے اس بات کا ثبوت بنا دیا کہ یہاں کوئی خدا نہیں ہے۔ بلکہ سارا نظام ایک مشینی عمل کے تحت اپنے آپ چلا جا رہا ہے۔

سائنس نے جو کائنات دریافت کی ہے وہ ایک حد درجہ بامعنی اور بامقصد کائنات ہے۔ جدید دریافتوں نے ثابت کیا ہے کہ ہماری دنیا منتشر مادہ کا بے معنی انبار نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کا منظم کارخانہ ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں بے حد ہم آہنگی کے ساتھ ایک ایسے رخ پر سفر کرتی ہیں جو ہمیشہ بامقصد نتائج پیدا کرنے والے ہوں۔ کائنات میں نظم اور مقصدیت کی دریافت واضح طور پر ناظم کی موجودگی کا اقرار ہے۔ وہ کائنات کے پیچھے خدائی کارفرمائی کا یقینی ثبوت ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے بے خدا مفکرین نے یہ کیا کہ اس سائنسی دریافت کا رخ الحاد کی طرف موڑ دیا۔ انھوں نے کہا کہ جو کچھ ثابت ہوا ہے وہ بجائے خود واقعہ ہے۔ مگر اس کا کیا ثبوت کہ وہ کوئی نتیجہ (End) ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہ محض ایک اثر (Effect) ہو۔ یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ یہاں کوئی ذہن ہو جو شعور اور ارادہ کے تحت بالقصد واقعات کو ایک خاص انجام کی طرف لے جا رہا ہو۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ واقعات کے بے شعور عمل کے اثر سے اپنے آپ ایک چیز برآمد ہو رہی ہو جو اتفاق سے بامعنی بھی ہو —— یہ بے معنی توجیہ خود ایک ارادہ کے تحت وجود میں آئی ہے۔ پھر کیسی عجیب بات ہے کہ بامعنی کائنات کو بلا ارادہ کارفرمائی مان لیا جائے۔

ایک طرف سائنس کے ظہور کے بعد ملحد مفکرین نے بہت بڑے پیمانہ پر سائنس کو الحاد کا رخ دینے کی کوشش کی ہے۔ دوسری طرف اس کے مقابلہ میں مذہبی مفکرین کی کوششیں اتنی ہی کم ہیں۔ پچھلے سو سال کے اندر ایک طرف ہزاروں کی تعداد میں اعلیٰ علمی کتابیں چھپی ہیں جن کے ذریعہ سائنس سے غلط طور پر الحاد کو برآمد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسری طرف دینی مفکرین کی صف میں چند ہی قابل ذکر علمی کوششوں کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ایک قابل قدر کتاب سر جیمز جینز کی پراسرار کائنات (The Myterious Universe) ہے۔ اس کتاب میں لائق مصنف نے نظریہ تعلیل (Principle of Causation) کو خالص سائنسی استدلال کے ذریعہ منہدم کر دیا ہے جس کو موجودہ زمانہ میں خدا کا مشینی بدل سمجھ لیا گیا تھا۔

موجودہ صدی کے نصف آخر میں بے شمار نئے حقائق انسان کے علم میں آئے ہیں جو نہایت برتر سطح پر دینی عقائد کی حقانیت کو ثابت کر رہے ہیں۔ مگر ابھی تک کوئی ایسا دینی مفکر سامنے نہیں آیا جو ان سائنسی معلومات کو دینی صداقتوں کے اثبات کے طور پر مدون کرے۔ اگر یہ کام اعلیٰ سطح پر ہو سکے تو وہ دعوت توحید کے حق میں ایک علمی معجزہ ظاہر کرنے کے ہم معنی ہوگا۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی میں جتنے پیغمبر آئے سب کی پیغمبری پر ان کے ہم عصر مخاطبین نے شک کیا (ہود ۶۲) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی ابتداءً یہی صورت پیش آئی کہ آپ کے مخاطبین اول آپ کی نبوت پر شک کرتے رہے (ص ۸) تاہم اسی کے ساتھ قرآن میں یہ اعلان کیا گیا کہ آپ کو مقام محمود پر کھڑا کیا جائے گا (عسیٰ ان یبعثک ربک مقاما محمودا) اس اعلان کا مطلب یہ تھا کہ آپ کی نبوت شک کے مرحلہ سے گذر کر ایک ایسے مرحلہ میں پہنچے گی جب وہ مکمل طور پر تسلیم شدہ نبوت بن جائے۔ محمود (قابل تعریف) ہونا تسلیم واعتراف کا آخری درجہ ہے۔

ہر نبی جب پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی قوم کے اندر ایک ایسی شخصیت ہوتا ہے جس کو لوگ شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ "معلوم نہیں یہ واقعۃً پیغمبر ہیں یا صرف دعویٰ کر رہے ہیں" اس طرح کے خیالات لوگوں کے ذہن میں گھومتے ہیں اور آخر وقت تک ختم نہیں ہو پاتے۔ پیغمبری اپنے ابتدائی دور میں صرف دعویٰ ہوتی ہے۔ وہ اپنے دعویٰ کا ایسا ثبوت نہیں ہوتی جس کو ماننے پر لوگ مجبور ہو جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی پیغمبر آیا وہ اپنی قوم کی نظر میں ایک نزاعی شخصیت بن گیا۔ کیونکہ پیغمبر کی صداقت کو جاننے کے لئے لوگوں کے پاس اس وقت اس کا صرف دعویٰ تھا۔ اس کے حق میں مسلمہ تاریخی دلائل ابھی جمع نہیں ہوئے تھے۔ اس قسم کے دلائل ہمیشہ بعد کو وجود میں آتے ہیں۔ مگر عام طور پر انبیاء کا معاملہ اس بعد کے مرحلہ تک پہنچ نہ سکا۔

دوسرے پیغمبر نزاعی دور میں شروع ہوئے اور نزاعی دور ہی میں ان کا اختتام ہو گیا۔

کیوں کہ ان کے بعد ان کے پیغام کی پشت پر ایسا گروہ جمع نہ ہو سکا جو ان کی سیرت اور ان کے کلام کو مکمل طور پر محفوظ رکھ سکے۔ دوسرے انبیاء اپنے زمانہ میں لوگوں کے لئے اس لئے نزاعی تھے کہ وہ ابھی اپنی تاریخ کے آغاز میں تھے، بعد کے دور میں وہ دوبارہ نزاعی ہو گئے۔ کیوں کہ بعد کو ان کی جو تاریخ بنی وہ انسانی علم کے معیار پر تسلیم شدہ نہ تھی۔

نبیوں کی فہرست میں اس اعتبار سے صرف پیغمبر آخر الزماں کا استثناء ہے۔ آپ نے اگرچہ دوسرے نبیوں کی طرح، اپنی نبوت کا آغاز نزاعی دور سے کیا۔ مگر بعد کے دور میں آپ کو اتنی غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی کہ زمین کے بڑے حصہ میں آپ کا اور آپ کے ساتھیوں کا اقتدار قائم ہو گیا ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں آپ کے دین نے ایشیا اور افریقہ کی بڑی طاقتوں کو زیر و زبر کر ڈالا۔

پیغمبر آخر الزماں کو جتنے چیلنج پیش آئے سب میں وہ فاتح رہے۔ آپ نے جتنی پیشین گوئیاں کیں سب مکمل طور پر پوری ہوئیں۔ جو طاقت بھی آپ سے ٹکرائی وہ پاش پاش ہو گئی۔ آپ کی زندگی میں ایسے واقعات پیش آئے جن کی بنا پر معاصر تاریخ میں آپ کا ریکارڈ قائم ہو گیا۔ ساری تاریخ انبیاء میں آپ کو یہ غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی کہ آپ کی نبوت نزاعی مرحلہ سے نکل کر محمودی مرحلہ میں پہنچ گئی۔ آپ کا کلام اور آپ کا کارنامہ دونوں اس طرح محفوظ حالت میں باقی رہے کہ کسی کے لئے آپ کے بارہ میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

موجودہ زمانہ میں دین حق کے داعیوں کو ایک ایسا خصوصی موقع (Advantage) حاصل ہے جو تاریخ کے پچھلے ادوار میں کسی داعی گروہ کو حاصل نہ تھا۔ وہ یہ کہ ہم آج اس حیثیت میں ہیں کہ توحید کی دعوت کو مسلّمہ (Established) نبوت کی سطح پر پیش کر سکیں۔ جب کہ اس سے پہلے توحید کی دعوت صرف نزاعی (Controversial) نبوت کی سطح پر پیش کی جا سکتی تھی۔

دوسری امتیں اگر نبوت نزاعی کی وارث تھیں تو ہم نبوت محمودی کے وارث ہیں۔ مسلمانوں کو اقوام عالم کے سامنے شہادت حق کا جو کام انجام دینا ہے اس کے لئے خدا نے آج ہر قسم کے مواقع مکمل طور پر کھول دیئے ہیں۔ اس کے باوجود اگر مسلمان اس کار شہادت کو انجام نہ دیں۔ یا شہادت دین کے نام پر قومی جھگڑے کھڑے کرنے لگیں تو مجھے نہیں معلوم کہ قیامت کے دن وہ رب العٰلمین کے سامنے کیوں کر بری الذمہ ہو سکتے ہیں۔

نومبر ۱۹۸۳ کے آخری ہفتہ میں لاہور میں قرآنی سیمنار ہوا۔ اس موقع پر راقم الحروف کو ایک مقالہ پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ زیر نظر مقالہ اسی سیمنار میں پیش کرنے کے لئے تیار کیا گیا۔

مسلک سلیمانی

ڈاکٹر غلام محمد

ایک ایسے دور میں جو اہل کمال علماء و فضلاء کا دور تھا، حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے گوناں گوں کمالات کی وجہ سے ایک انفرادیت حاصل تھی۔ ان کی ذات میں حضرت شاہ ولی اللہ کا عمق اور عبقریت، علامہ ابن قیمؒ کی وسعت اور محتاط فکری حریت اور امام غزالی کی حکمت و للّٰہیت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے، اسی لیے ان کو سمجھنے اور ان کے مسلک کا واضح تصور حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور اس کی کوشش میں ضروری ہے کہ نہ تو اپنے ذوق اور رنگ نظر کو آنے دیا جائے اور نہ تنقید یا توثیق غیر کے خیال کو کوئی اہمیت دی جائے بلکہ ان کو ویسا ہی دیکھا جائے، جس انداز سے وہ بزم آرا رہے۔

حضرت علامہ کی شخصیت چونکہ پہلو دار ہے اس لیے ہم اختصار کے ساتھ مگر الگ الگ دیکھیں گے کہ تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف اور اجتماعیات میں ان کا مسلک کیا تھا؟

تفسیری مسلک

حضرت علامہ کے نزدیک قرآن پاک کا سب سے یقینی اور صحیح مطلب و مفہوم صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل سے متعین ہوتا ہے، اس لیے قرآن فہمی کے لیے بنیادی توجہ حدیث و سنت پر رہنی ضروری ہے، وہ فرماتے ہیں۔

"قرآن خدا کا کلام ہے جو ۲۳ برس کی مدت میں تھوڑا تھوڑا کر کے ملک عرب میں فصیح و بلیغ عربی زبان میں خدا کے ایک برگزیدہ بندہ پر اترا، اس میں نظریے بھی تھے اور عملی تعلیم بھی، اس نے ان نظریوں کو خدا کے بندوں کو سمجھایا اور ان کی عملی تعلیمات کو عملاً کر کے اور برت کے اپنے آس پاس والوں کو دکھایا اور بتایا اور اس لیے کہ وہ اسی کلام کا پہلا مخاطب تھا اور اسی کے ذریعہ اس کلام کا مطلب دوسروں کو سمجھانا تھا، اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ وہی اسلام کے مطلب کو سب سے معتبر سمجھ سکتا تھا، اور اسی لیے اس کلام کا جو مطلب سمجھا اور اپنی تعلیم و عمل سے اس نے دوسروں کو جو سمجھایا وہی اس کا صحیح اور بے خطا مطلب اور مفہوم ہے۔ اس لیے قرآن پاک کے سمجھنے کے لیے حامل قرآن محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی اور عملی تفسیر سے

بہتر قرآن کی تفسیر کا کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا۔" (معارف ۱۹۳۸ء)

اس کے بعد دوسری چیز "زبانِ عربی" اس کے قواعد اور محاورۂ عرب سے پوری پوری آگاہی ہے، جس کے بغیر قرآن پاک کی صحیح تفسیر ممکن نہیں، حضرت علامہ فرماتے ہیں۔

"کسی کتاب کا صحیح مطلب سمجھنے کے لیے سب سے اہم چیز اس کتاب کی زبان اور اس زبان کے قواعد کی پیروی ہے۔ یہ کسی طرح درست نہ ہوگا کہ ہم عقلیت کے جوش میں اس کتاب کے کسی فقرہ کی تشریح میں اس زبان کی لغت اور قواعد میں ایسا تصرف کریں جو ہر حیثیت سے ناجائز ہو اور ہمارے اس تصرف کا منشأ صرف اتنا ہو کہ ہم اپنے استبعادِ عقلی کی تسکین کر سکیں۔" (ایضاً)

اس کے بعد جو بات فرمائی ہے، وہ بہت غور سے سننے کی ہے، تحریر فرماتے ہیں۔

"حالانکہ استبعادِ عقلی کوئی یکساں چیز نہیں اور نہ وہ خلافِ عقل کے معنوں میں ہے، عقل کی وسعت اور استبعاداتِ عقلی کی فہرست ہر زمانہ میں گھٹتی اور بڑھتی رہی ہے، اس لیے قرآن پاک کی تفسیر کا یہ معیار نہیں بنایا جا سکتا۔" (ایضاً)

اب رہی یہ بات کہ ہر زمانے میں عقلی مسلمات بدلتے رہتے ہیں اور ان کی وجہ سے فکری فضا بدلتی رہتی ہے اور ہر دور کے لوگ اپنے زمانہ کے مؤثرات کے تحت ہی کسی بھی کلام کو سمجھنا چاہتے ہیں، اس لیے قرآن فہمی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ٹھہر سکتی۔ تو اس کا جواب حضرتِ علامہ یہ دیتے ہیں۔

"فانی انسانوں کے فانی کلام اور جزئی علم رکھنے والوں کے جزئی علم، اگر ایک زمانہ میں صحیح اور دوسرے زمانہ میں غلط ہو جائیں تو ایسا ہونا بہت حد تک قرین قیاس ہے، مگر خدائے پاک کے کلام میں جس کا علم ازل سے ابد تک کو محیط ہے، اس قسم کا تصور بھی ذہن میں نہیں لایا جا سکتا اس لیے اگر مخلص اہلِ علم اور نیک نیت علماء اس کلام کی مزید تشریح اپنے زمانہ کے مؤثرات کے مطابق اس طرح کر سکیں کہ وہ متکلم کے اصول متواترہ، مخاطب اوّل صلی اللہ علیہ وسلم کی تفہیم اور زبان کی لغت و قواعد کے خلاف نہ ہوں۔ تو ان کی یہ سعی مشکور ہوگی۔ اسی بنا پر جب سے مسلمانوں میں عقلیات کا رواج ہوا، اس نظر سے بھی قرآن پاک کی تفسیریں لکھی گئیں۔ معتزلہ میں ابو مسلم اصفہانی کی تفسیر اور قاضی عبد الجبار معتزلی کی تنزیہ القرآن اور اہلِ سنت میں امام ابو منصور ماتریدی کی تاویلات اور امام ابن فورک کی مشکلات القرآن، امام محمد غزالی کی جواہر القرآن اور سب سے آخر میں امام فخر الدین رازی کی تفسیر کبیر اپنے اپنے زمانہ کے مؤثرات کی بہترین ترجمان ہیں۔" (ایضاً)

آپ اپنے زمانہ کے مؤثرترین "بہترین ترجمان" کا جملہ خوب ذہن نشین رہے کیونکہ اسی بنیاد پر علامہ مرحوم آخر حیات تک یہی فرماتے تھے، کہ قرآن کی بہترین "تفسیر کسی بھی تفسیر کو قرار نہیں دیا جاسکتا" یہی جواب انھوں نے عین مرض وفات میں اس وقت کے سفیر شام متعینہ پاکستان کو بھی دیا تھا جب سفیر صاحب نے ان سے یہ پوچھا تھا کہ قرآن پاک کی سب سے اچھی تفسیر کون سی ہے ؟

حضرت علامہ کے تفسیری مسلک کے سلسلہ میں ایک اور اہم بات، یاد رکھنے کی یہ ہے کہ وہ الفاظِ قرآنی کے مراد ظاہری سے عدول کو روا نہیں رکھتے تھے۔ میرے استاذ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رح کو قرآنی آیات سے اعتبارات، صوفیانہ نکات اور آیات کے نتائج قیاسی نکالنے کا خاص ذوق تھا، اور اس کے اثر سے اس عاجز کی طبیعت بھی اس نہج کے نکتوں اور چٹکلوں کو پڑھ کر جھوم جاتی ہے۔ مگر جب ایسی کوئی بات میں نے حضرت علامہ سے نقل کی تو سختی سے متنبہ فرمایا کہ الفاظ قرآنی کے "ظاہر مراد" سے عدول نہ ہونا چاہیئے، نیز خود قرآنی مراد کو معلوم کرنے کے لیے ایک ہی لفظ کے جتنے استعمالات قرآن پاک میں آئے ہیں، ان سب کا احاطہ کرکے اس کی مراد کو متعین کرنا چاہیئے، مثلاً قرآن پاک میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "خاتم النبیین" کہا گیا ہے، تو اب دیکھنا چاہیے کہ لفظ "خاتم" قرآن پاک میں کس کس معنی میں بولا گیا ہے تاکہ ختم نبوت کا قرآنی مفہوم متعین ہوسکے۔ چنانچہ دیکھا جائے تو یہ لفظ یا تو اس معنی میں بولا گیا ہے کہ کسی چیز کو اس طرح بند کردینا کہ باہر کی چیز اندر نہ جاسکے جیسے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ (یعنی رسول کی بات دل میں نہیں جاسکتی) یا پھر اس معنی میں بولا گیا ہے کہ کسی چیز کو اس طرح بند کردینا، کہ اندر کی چیز باہر نہ نکل سکے جیسے اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤی اَفْوَاهِهِمْ (یعنی حشر کے دن کافروں کے دل کی کوئی بات منہ سے باہر نہ نکل سکے گی) - یا پھر یہ لفظ ان دونوں معنوں کی یکجائی کے ساتھ بولا گیا ہے، جیسے وَخِتٰمُهٗ مِسْكٌ (یعنی جنتیوں کو جو شراب کی بوتل ملے گی اس پر مشک کا ختام ہوگا جو اس بات کی ضمانت ہوگی کہ اس بوتل کو اس طرح بند کردیا گیا ہے کہ اب اس میں سے نہ تو اندر کی چیز باہر آسکتی ہے نہ باہر سے کوئی چیز اس کے اندر داخل ہوسکتی ہے) بس ان تین استعمالات کے سوا لفظ "خاتم" کا کوئی اور استعمال قرآن پاک میں نہیں ملتا، اس لیے "وخاتم النبیین" کا قرآنی مفہوم صاف یہ نکل آیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس معنی میں نبیوں کے "خاتم" بنائے گئے ہیں کہ آپ سے پہلے جو نبی ہوچکے [illegible] ان میں سے کوئی بھی نبی دائرۂ نبوت سے خارج تصور نہیں کیا جاسکتا، اور آپ کے بعد کوئی [illegible] اس دائرہ مقدسہ میں داخل نہیں ہوسکتا۔

[illegible] قرآن اور [illegible] کا تازہ اعجاز۔

اور یہ تو ایک مثال ہے، سیرت النبی کی ضخیم مجلدات کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو علامہ مرحوم کا یہ مسلک و ذوقِ تفسیری جگہ جگہ نمایاں نظر آئے گا۔

ع تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل

اب ایک آخری بات تفسیری مسلک کے سلسلہ میں یہ عرض کرنی ہے کہ متشابہات قرآنی کے بارے میں حضرت علامہ کا مسلک قدمائے اہل سنت والجماعۃ والا مسلک تھا کہ خدا کی ذات وصفات اور دیگر عقائد کے متعلق قرآن پاک نے جو کچھ بیان کیا ہے یا پیغمبر خاتم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہ تواتر جو کچھ ثابت ہے اس پر ایمان رکھتے ہوئے اپنی عقل وقیاس اور استنباط سے اس کی تشریح کرنا صحیح نہیں، گویا حضرت علامہ کے نزدیک وَمَا یَعْلَمُ تَأْوِیْلَهٗ اِلَّا اللّٰهُ (اس کا منشاء ومفہوم خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا) ایک حقیقت اعتقادیہ ہے جس سے یہ مسلک بنا کہ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا یعنی جو پختہ علم ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ بس ہم اس پر ایمان لائے کہ یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے۔ بالفاظ دیگر متشابہات کے معاملہ میں حضرت علامہ تشبیہ کے قائل تھے مگر تنزیہہ کے ساتھ۔ وہ ید ۔ قدم ۔ اِسْتَوٰی وغیرہ کی کوئی تاویل نہیں فرماتے تھے مگر ان میں کی ہر حقیقت کو لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ کے وصف سے متصف جان کر ہر تشبیہ کو تصور انسانی سے پاک اور رسائی فہم سے وراء الوریٰ سمجھتے تھے۔

حدیثی مسلک قرآن پاک کے بعد دین کی دوسری اہم اصل حدیث نبوی ہے قرآن وحدیث کے باہمی ربط اور نزاکت ارتباط کو حضرت علامہ نے ایک وجد آفریں جملہ میں یوں ادا فرمایا ہے۔

> "علم قرآن اگر اسلامی علوم میں دل کی حیثیت رکھتا ہے تو علم حدیث شہ رگ کی۔ یہ شہ رگ اسلامی علوم کے تمام اعضاء وجوارح تک خون پہنچا کر ہر آن ان کے لیے تازہ زندگی کا سامان پہنچاتا رہتا ہے" (تعارف ۔ تدوین حدیث از مولانا گیلانیؒ)

حدیث پڑھنے پڑھانے والے علماء بحمد اللہ ہر دور میں بہت رہے ہیں اور رہیں گے مگر جو خود مزاج اور رنگ سنت کا مرقع ہوں، ایسے محدث خال خال ہی ملیں گے، حضرت علامہ اسی فہرست کے فرد فرید تھے۔ ان کی تاریخ دانی کا شہرہ خود ہی ان کے مفسرانہ اور محدثانہ کمالات کا حجاب بنا ہوا تھا، اس پر ادارتی تعصب نے ان کے معاصرین کے ہاتھوں اس کو ایک دیوار بنا کر کھڑا کر دیا ورنہ سیرۃ النبی خصوصاً اس کی جلد سوم، سیرت عائشہ اور خطبات مدراس کا ایک غیر جانبدار پڑھنے

والا اور فن حدیث کا واقف ... کار علامہ کے ... محدث اور ماہر فن رجال ہونے کا انکار کیسے کر سکتا ہے؟ حضرت علامہ محدث تھے اور ان کا حدیثی مسلک احتیاط اور حزم محدثانہ پر مبنی تھا۔ وہ اس وقت بھی اس معاملہ میں سخت تھے جب باضابطہ حلقۂ طریقت میں داخل نہیں ہوئے تھے اور اس وقت بھی ویسے ہی مستحکم رہے جب وہ شیخ طریقت مانے گئے۔ اکثر صوفیاء کرام اپنے ذوق یا وجدان کے سہارے بعض مقولوں کو حدیث کے عنوان سے بیان کرتے ہیں، ادھر حضرات علماء اپنے موضوعہ اصول کی بنا پر "فضائل" میں توسیع اختیار کر کے ضعیف ترین احادیث کو اپنی تصانیف میں فراخی کے ساتھ شامل رکھنے میں مضائقہ نہیں سمجھتے۔ مگر حضرت علامہ کا مسلک کسی پہلو سے بھی ان گنجائشوں کا متحمل نہیں تھا۔ وہ فرماتے تھے۔ اور اس وقت ان پر خوف چھا جاتا تھا، کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سن کر کہ من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار (بخاری) (یعنی جو مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے گا اسے چاہیئے کہ اپنا ٹھکانہ آگ میں تیار کر لے) میرا دل لرز جاتا ہے کہ مبادا کوئی قول ایسا حضور کی طرف منسوب ہو جائے جو آپ نے نہ فرمایا ہو اور اس کی وجہ سے اس وعید کا مورد بننا پڑے۔ راقم حروف نے حضرت علامہ کا منشا یہ سمجھا کہ حزم و احتیاط کے سبب کوئی ارشاد نبوی نقل سے رہ جائے تو اس پر تو کسی عتاب و عقاب کا اندیشہ نہیں مگر غلط انتساب سے تو جہنم مول لینا ہوگا۔ العیاذ باللہ۔ اسی لیے دیکھا اور بار بار دیکھا کہ قبول حدیث میں علامہ نے کبھی عرفی دباؤ بھی قبول نہیں فرمایا۔ میرے سامنے کی بات ہے کہ ایک مولوی صاحب نے حضرت علامہ سے سوال کیا کہ کیا اقطاب و ابدال کا موجود ہونا قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ علامہ نے فرمایا کہ نہیں البتہ بہ کثرت بزرگوں کی کشفی تصدیقات ملتی ہیں، اور وہ کافی ہیں، اس پر انہوں نے تعجب سے مکرر عرض کیا کہ احادیث میں بھی اس کا ذکر نہیں۔ حضرت علامہ نے اپنی طبعی نرم مزاجی سے دوبارہ فرمایا جی نہیں، کوئی صحیح اور قوی حدیث ایسی نہیں ملتی۔ اس پر ان مولوی صاحب نے دباؤ ڈالنے کے ... کہ حضرت مولانا تھانوی (جو حضرت علامہ کے پیر طریقت تھے) نے تو تعلیم ... میں تائید ... حدیثیں تحریر فرمائی ہیں، حضرت علامہ کو ان کا یہ غیر عالمانہ طرز ناگوار ہوا اور قدرے چیں بہ جبیں ... فرمایا ... حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے، میں نے تو نہیں لکھا، آپ مجھ پر دباؤ ... ہیں۔ پھر جب یہ صاحب چلے گئے تو احقر کو مخاطب کر کے یہی فرمایا کہ میں کیا کروں، میرا تو دل لرز جاتا ہے کہ کوئی قول حضور کی جانب ایسا منسوب ہو جو آپؐ کا ارشاد نہ ہو۔

”جناب نے جب بے تکلف اپنا مسلک تحریر فرمادیا، اس سے میری عقیدت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہوگیا۔ دو وجہ سے، ایک صدق و خلوص پر دال ہونے سے۔ دوسرے خود مسلک کے پاکیزہ ہونے سے، تمام اہل حق کا یہی مسلک ہے کسی جزئی تفاوت سے حقیقت نہیں بدلتی صرف رنگ بدلتا ہے چنانچہ اس احقر پر..... دوسرا رنگ ہے کہ میں بوجہ اپنی قلت روایت و درایت کے متاخرین کا بھی متبع ہوں“ (ایضاً)

غرض گو اکثر امور میں حضرت علامہ حنفی مذہب ہی کے پیرو تھے، رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ تراویح میں بیس رکعت کا التزام تھا، مگر ساتھ ہی قرأت فاتحہ خلف الامام اور ناگزیر صورت میں جمع بین الصلاتین پر بھی ان کا عمل تھا اسی طرح فتویٰ لکھنے میں بھی شدومد سے ایک مسلک کے پابند نہ تھے، اس سلسلہ کا ایک چشم دید دلچسپ واقعہ سنیئے اور اس سے حکمت سلیمانی کا اندازہ لگائیے ایک انگریز میاں بیوی مشرف بہ اسلام ہوئے چند ہی دنوں بعد آپس کی ناچاقی میں شوہر نے بیوی سے ایسے کلمات کہہ ڈالے کہ مذہب حنفی کی رو سے طلاق مغلظہ واقع ہوگئی۔ یہ ماجرا ان کے ایک مسلمان دوست عزیز نے سنا تو انہوں نے شوہر سے کہا کہ تمہارا تو نکاح ہی فسخ ہوگیا اب نومسلم میاں بیوی بھی پریشان اور ان کے دوست بھی حیران احتیاطاً ان دوست نے بعض معتبر مفتیوں سے رجوع کیا مگر جواب ہر جگہ سے طلاق قطعی ہی کا ملا پھر وہ حضرت علامہ کی خدمت میں آئے، سارا ماجرا سنایا علامہ نے فرمایا جس مفتی صاحب (یعنی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع) سے پوچھئے۔ انہوں نے عرض کیا کہ وہاں سے تو یہی جواب ملا، علامہ نے مسکراتے ہوئے فرمایا تو آپ کا ہی کہا ہوا [illegible] ان سے فرمایا کہ آپ، ایک استفتاء لکھ کر کل مفتی صاحب کے مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں لائیے، مجھے جو کچھ لکھنا ہے، میں وہیں لکھ دوں گا، چنانچہ دوسرے روز جلسہ جب ختم ہوا اور مخصوص علماء، جن میں حضرت مفتی محمد حسن امرتسری، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور خود حضرت میزبان ممتاز ترین تھے۔ پہلے نوشی کے لیے ایک کمرہ میں بیٹھ گئے تو علامہ نے ان صاحب سے استفتاء لے کر ایک ایک کو دکھلایا۔ متفقہ جواب یہ تھا کہ ”طلاق واقع ہوگئی“۔ پھر حضرت علامہ نے اپنے قلم سے اس پر فتویٰ یہ تحریر فرمایا۔ کہ ”اہل سنت والجماعۃ میں مسلک اہل حدیث کی رو سے طلاق واقع نہیں ہوئی رجوع کرا دیا جائے“ (لفظی تعبیر ممکن ہے، غالب یاد داشت یہی ہے) پھر علماء کرام کو یہ جواب دکھاتے ہوئے فرمایا کہ ”نومسلم بیچارے تو ابھی نہ حنفی ہیں اور نہ شافعی لہٰذا قانون میں کوئی گنجائش بھی نکلتی ہو تو اس کا فائدہ انہیں ملنا چاہیئے“ اس پر حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے برملا فرمایا کہ یہ جواب حضرت ہی لکھ

سکتے تھے ہم چونکہ فقہ حنفی کے مفتی ہیں اس سے نہیں لکھ سکتے پھر مفتی اعظم پاکستان نے بھی اس قول کی تائید فرمائی۔

ایک اور بات، اکثر فقہاء نے مدات زکوٰۃ والی آیت اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ الخ میں فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ سے مراد صرف جہاد بالسیف لیا ہے اور لِلْفُقَرَآءِ کے لام کو لامِ تملیک قرار دیا ہے حضرت علامہ کے نزدیک یہ تحدیدات درست نہیں۔ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ میں ہر دینی کام شامل ہو سکتا ہے اور لِلْفُقَرَآءِ کے لام کو لامِ انتفاع لینا چاہیئے۔ سیرۃ النبی جلد پنجم میں اس مقام پر یہ بصیرت افروز حاشیہ سپرد قلم فرمایا ہے۔

"اکثر فقہاء نے فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ سے مراد صرف جہاد لیا ہے مگر یہ تحدید صحیح نہیں معلوم ہوتی ابھی آیت گذر چکی ہے۔ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ اس سے بالاتفاق صرف جہاد نہیں بلکہ ہر نیکی اور دینی کام مراد ہے۔ اکثر فقہائے یہ بھی کہا ہے کہ زکوٰۃ میں تملیک یعنی کسی شخص کی ذاتی ملک بنانا ضروری ہے مگر ان کا استدلال جو لِلْفُقَرَآءِ کے لام تملیک پر مبنی ہے، بہت کچھ مشتبہ ہے، ہو سکتا ہے کہ لام انتفاع ہو جیسے خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا"

علامہ کی یہ توضیح فرنگی دَورِ غلامی میں چاہے ہمارے علماء کے لیے ناقابل اعتنا رہی ہو مگر آج پاکستان میں ترویج زکوٰۃ کے مرحلہ پر اس کی اہمیت اور افادیت پر اگر توجہ نہ دی گئی تو محض ایک روایتی تعبیر پر اصرار کی وجہ سے صرف زکوٰۃ کا دائرہ، اپنے ہاتھوں آپ محدود ہو کر رہ جائے گا۔ اور دوسری طرف اہل مدارس کی چلائی ہوئی "حیلۂ تملیک" کی قباحت کو قانونی تحفظ حاصل ہو جائے گا۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ!

صوفیانہ مسلک

حضرت علامہ کا گھرانہ خانوادۂ نقشبندیہ سے منسلک تھا اور خود علامہ کی ابتدائی روحانی تربیت ان کے برادر بزرگ سید ابو حبیب رحمۃ اللہ علیہ کے زیر اثر ہوئی تھی جو قطب وقت شاہ ابو احمد بھوپالی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اور ذوق اتباع سنت میں مثال تھے، لازما اتباع سنت کا یہ نکھرا ہوا ذوق علامہ کے قلب و دماغ نے بھی قبول کیا دوسری طرف علامہ شبلی نعمانی رح نے اپنے اس جواں عمر شاگرد عزیز کے ساتھ بھی یہی معاملہ فرمایا کہ بقول حضرت سلیمان رح اپنی زندگی میں اور اپنی زندگی کے بعد بھی یہ شکل وصیت، سرور کائنات، فخر موجودات، رحمت عالم، سید اولاد آدم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرکار اقدس میں، جہاں وہ سب سے آخر پہنچے تھے، سب سے اول پہنچایا" (حیات شبلی صفحہ)

راست اتباع نبوی کا یہ ذوق متوجہ بہ تصوف ہو کر اور زیادہ تیز ہو گیا تھا، اس کا اظہار اپنے پہلے عریضہ میں مرشد تھانوی رح سے ان الفاظ میں کیا ہے۔

اور دوسرے

(۲) لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (یعنی اپنی خدمات میں مخلوق کی طرف سے جزا یا قدردانی کے صلہ سے بے نیازی)

اسی لیے حضرت علامہ کے مسلکِ اجتماعی میں بڑی ہمہ گیری تھی، ان کا اجتماعیاتی مسلک آویزش و محاذ آرائی کی تلخیوں سے پاک، منصب وجاہ کی حرص اور نمود و شہرت کی نفسانی خواہشات سے منزہ تھا یہاں کسی خاص جماعت میں نہ انضمام تھا نہ کسی سے انقطاع بلکہ انضمام و انقطاع کے درمیان "بے غرض تعاون" تھا جو صرف امت محمدیہ سے محبت اور اس کی دلسوزی کے محرکات اور صرف اور صرف رضائے الٰہی کی طلب کے اضطراب قلبی کا نتیجہ تھا۔

اللہ تعالیٰ کی ہزارہا رحمتیں اور پیہم نوازشیں ہوں ایسے پاکیزہ مسلک سید الملت والدین حضرت علامہ سید سلیمان ندوی (قدس سرہٗ) کی رُوح پُرفتوح پر۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

تصوف کی حقیقت و اہمیت

مولانا الطاف الرحمٰن بنوی

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم:

سورہ ذاریات کی آیت ۵۶ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ سے قطعی طور پر ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن و انس کو عبادت اور بندگی کے لیے پیدا کیا ہے بندگی اور عبادت کا کیا مطلب ہے؟ اس سلسلے میں بزرگان دین کے بے شمار اقوال منقول ہیں جن میں گو تعبیر کا تھوڑا بہت اختلاف ضرور موجود ہے لیکن مفہوم و معنی کے اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں ہے ہمارے بعض اساتذہ عبادت کی تعریف میں علامہ ابن قیم کی اس تشریح و توضیح کو بہت پسند فرماتے تھے جو انہوں نے مدارج السالکین جزو اوّل میں ان الفاظ سے فرمائی ہے

ھی عبادۃ عن الاعتقاد والشعور بان للمعبود سلطۃ غیبیۃ (فی العلم والتصرف) یقتدر بہا علی النفع والضر فکل دعاء وثناء وتعظیم ینشأ من ھذا الاعتقاد فھی عبادۃ۔

یعنی عبادت دعا و پکار اور تعظیم و ستائش کی ہر وہ شکل ہے جو اس شعور و اعتقاد کے ساتھ صادر ہو کہ معبود کو میرے اوپر ایک غائبانہ تسلط حاصل ہے جس کی بدولت وہ فوق الاسباب طریقے سے مجھے نفع اور ضرر پہنچا سکتا ہے۔

عبادت کے اس مفہوم کا ایک سرسری تجزیہ بھی یہ سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ معبود کی عظمت کا استحضار اور اُسی کے ساتھ خوف و محبت کا دائمی تعلق خاطر عبادت کے ہر عملی مظہر کا وہ محور و مدار ہے جس کے بغیر کوئی بھی عبادت رسم عبادت تو ہو سکتی ہے حقیقی عبادت ہرگز نہیں۔

حضرات گرامی! میں سمجھتا ہوں کہ تصوف کی حقیقت و اہمیت کے بارے میں مَیں نے جو کچھ عرض کرنا ہے ان مختصر کلمات میں اس کا اجمال عرض کر چکا، لیکن میں اسی پر اکتفا ہرگز نہیں کروں گا اس لیے بھی کہ یہ مسئلہ ہماری انفرادی اور اجتماعی اصلاح کی ہر مہم میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ کوئی بھی فرد یا جماعت تصوف کی روح کو اپنے اندر جذب کیے بغیر کسی مفید تبدیلی

کی کوئی توقع نہیں رکھ سکتی، اور اس پہ بھی کہ بعض ستم گروں نے بیچارے تصوف کے خوف ناکردہ گناہوں کا ایک لمبا چوڑا فردِ جرم عائد کر دیا ہے اور اسی کی بنیاد پر اس کو بدنام کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہوا ہے۔

معزز سامعین! نفسِ معبود اور اس کی عبادت کا تصور تو فطرتِ انسانی کا وہ لازمی اندرونی داعیہ ہے جس سے وہ زمانے کے کسی دور میں بھی خالی نہیں رہا ہے۔ اختلاف جب اور جو کچھ رونما ہوا، اس قدرِ مشترک کے بعد معبود کی نوعیت کی تعیین اور اس کے طریقۂ بندگی کی تشخیص میں ہوا۔ اس مدعا پر "كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ط" اور "كل مولود يولد على الفطرة فابواه يهودانه او ينصرانه او يمجسانه" جیسے قرآنی و حدیثی دلائل کے علاوہ ان لوگوں کی تحقیقات بھی شاہد ہیں جو ان مسائل پر سوچنے میں اپنی پوری پوری عمریں یا کم از کم اس کا ایک معتدبہ حصہ صرف کر دیتے ہیں۔ علامہ شبلی نے الکلام میں مشہور محقق مکس مولر کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "ہمارے اسلاف نے خدا کے سامنے اس وقت سر جھکایا تھا جب کہ وہ اس کا نام بھی نہ رکھ سکے تھے۔ جسمانی خدا اس حالت کے بعد پیدا ہوئے کہ فطرت اصلی مثالی صورت کے پردے میں چھپ گئی۔"

خدا کی تعیین اور طریقہ بندگی کی تشخیص کے لیے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا گیا چنانچہ ان سب نے پہلی بات کے بارے میں تو یک زبان ہو کر یہی تعلیم دی کہ باری تعالیٰ اپنی ذات و صفات میں وحدہٗ لاشریک ہے اس سلسلے میں کوئی بھی اس کا ہم پایہ و ہم مرتبہ نہیں۔ البتہ دوسری بات کے بارے میں ان کی تعلیمات کہیں متوافق اور کہیں متضادت ہوئیں، اس توافق و تخالف کو سمجھنے کے لیے ادیانِ سماویہ کے اجزائے ترکیبی پر ایک نگاہ ڈالنی ضروری ہے تاکہ اس کے ہر ہر جزو کی مخصوص نوعیت معلوم ہو سکے۔ ہر دینِ سماوی اپنے ماننے والوں کے سامنے تین باتوں کی لازمی طور پر وضاحت کرتا ہے۔

۱۔ انسانی زندگی کی علمی بنیادیں کیا ہیں۔
۲۔ اس کی عملی صورتیں کیا ہیں۔
۳۔ اس علم و عمل کو ایک دوسرے سے مربوط کرنے کے طریقے اور تقاضے کیا ہیں۔

آسان اور مصطلح لفظوں میں اس کی تعبیریں بھی کی جا سکتی ہے کہ ہر آسمانی دین بنیادی عقائد، شرعی اعمال اور اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔ بنیادی عقائد میں توحید کے ساتھ نبوت و قیامت کی ضروری تفصیلات بھی آجاتی ہیں۔ شرعی اعمال میں عبادات و معاملات سے بحث ہوتی ہے۔ اور اخلاق کے عنوان سے اخلاص و ایثار اور ان دونوں کے نظری اور عملی لوازم کی تلقین کی جاتی ہے بنیادی عقائد کے بارے میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء و رسل نے ایک جیسی تفصیلات بیان کیں، اس سلسلے میں ادیان سماویہ میں سرمو برابر اختلاف نہیں رہا۔ شرعی اعمال میں ہر دین نے اس دور کے احوال و ظروف، اپنے دائرہ کار اور مخصوص مزاج کے مطابق راہ عمل تجویز کیا۔ اخلاقی کلیات یعنی اخلاص و ایثار پر تو تمام ادیان نے یکساں طور پر زور دیا ہے۔

البتہ ان کے عملی لوازم میں کہیں کہیں تھوڑا بہت اختلاف رونما ہوا ہے، ادیان سماویہ کے اجزائے ترکیبی کے اس مثلث میں اجزائے ثلاثہ کی کیا نوعیت اور اہمیت ہے اس کو چند مثالوں سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔

اگر دین کے مجموعے کو کسی ریل گاڑی سے تشبیہ دی جائے تو اس کے عقائد اس گاڑی کا وہ انجن ہوں گے جس کی قوت و حرکت سے پوری گاڑی منزل مقصود کی طرف رواں دواں ہے، شرعی اعمال کی حیثیت اس گاڑی کے ان ڈبوں کی ہے جن سے اس گاڑی کی ہیئت کذائی تشکیل پائی ہے۔ اور اس کی اخلاقی قدریں بعینہٖ اُن آہنی زنجیروں کی طرح ہیں جو ڈبوں کو انجن سے مربوط رکھتی ہیں۔ دین اور اس کے اجزاء کو ہمارے نظام برقیات سے بھی تشبیہ دی جا سکتی ہے دینی عقائد وہ بجلی گھر ہے جو برقی قوت پیدا کرتا ہے اعمال شرعیہ وہ برقی آلات ہیں جو ہمارے گھروں میں قسم قسم کے پنکھوں، قمقموں اور لاتعداد چھوٹی بڑی مشینوں کی صورت میں نصب ہیں۔ اور اخلاق وائرنگ کے وہ انتظامات ہیں جو برقی رو کو ان آلات میں پہنچاتے ہیں۔

دینی مجموعے کو ہم اس جملے سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں جس کے ذریعے ہم اپنے مخاطب کو اپنے مافی الضمیر سے آگاہ کرتے ہیں مثلاً زید عمر سے کہتا ہے کہ زمین گول ہے اس کلام میں زمین مبتدا، گول خبر، اور ہے رابطہ ہے تو عقائد مبتدا، اعمال شرعیہ خبر اور اخلاق اس مبتدا اور خبر کے درمیان رابطہ ہے۔

معزز سامعین! ان مثالوں پر غور فرمائیے۔ جیسے آہنی زنجیروں کے بغیر ریل گاڑی،

وائرنگ کے بغیر برقی نظام اور رابطہ کے بغیر جملہ عملی طور پر بالکل بے سود ہے اسی طرح سے اخلاق کے بغیر دین بے معنیٰ ہے کہ اسپر موعودہ دنیاوی اور اخروی نتائج میں سے کوئی نتیجہ بھی مرتب نہیں ہوتا۔

حضرات! میں سمجھتا ہوں کہ اخلاص و ایثار کو اخلاق کے کلیات کا درجہ حاصل ہے۔ اسکے بعد خشیت و محبت، حضور و توجہ، رحم و رقت، رجوع و انابت، انکسار و تذلل، صبر و قناعت، اعتماد و توکل، شرم و حیا اور نصیحت و خیر خواہی اخلاص کے اور جود و سخا، حمیت و شجاعت، عفت و پاکدامنی اور امانت و دیانت وغیرہ ایثار کے فروع ہیں۔

اخلاق کی اس تفصیل کے بعد میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اجزائے دین میں مختلف مثالوں کی مدد سے ہم نے اخلاق کا جو مرتبہ و مقام متعین کیا ہے وہ خالص فقہی نقطہ نظر سے ہے جس میں اعمال کے ظاہر کو نسبتاً زیادہ وقعت دی جاتی ہے نہیں تو زیادہ تحقیقی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو دین میں اخلاق کا مقام ایسا ہی ہے جیسے کہ بدن میں رُوح کا، چنانچہ جسطرح بدن کی ساری کارکردگی کا مدار روح پر ہے۔ اسی طرح سے بندگی کی پوری عمارت اخلاص و ایثار پر استوار ہے نبی علیہ السّلام کا ارشادِ گرامی ہے کہ " بعثت لاتمم مکارم الاخلاق " اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اخلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ " کان خُلقہُ القرآن " چنانچہ معلوم ہوا کہ نبوّت کا مقصد بعثت بھی تتمیم اور تکمیلِ اخلاق ہے اور قرآن کا موضوع بحث بھی اخلاق ہے۔ یاد رہے یہاں اخلاق کا اطلاق اس محدود معنی میں ہرگز نہیں ہے جسمیں فقط انسانوں ہی کے باہمی تعلقات کا ذکر ہوتا ہے بلکہ یہاں اخلاق سے وہ عام مفہوم مراد ہے جسمیں خالق و مخلوق دونوں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت پر بحث ہوتی ہے۔

اخلاق عنوان ہے ان تمام تفصیلات کا جن کو قرآن حکیم میں تزکیہ اور حدیث میں احسان کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نبی علیہ السلام کے مقصدِ بعثت کے سلسلۂ بیان میں قرآن مجید میں کئی دفعہ آپ کے جن فرائض منصبی کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اس کی ترتیب سے تزکیہ کے مہتم بالشان ہونے پر کافی روشنی پڑتی ہے کلام فصیح کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ اس میں جب کسی ایک سلسلے کی متعدد چیزیں بیان کرنی مقصود ہوں تو ان کو ایک خاص ترتیب سے بیان کیا جاتا ہے اور اس ترتیب میں تقدیم و تاخیر کے مختلف

وجوہ ہوا کرتے ہیں۔

نبی علیہ السلام کے فرائض منصبی کو سورہ بقرہ آیت ۱۲۹ میں اس طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۔ علاوہ ازیں سورہ بقرہ آیت ۱۵۱ سورہ آل عمران آیت ۱۶۴ اور سورۃ الجمعہ آیت ۲ میں انہی مقاصد اربعہ کو انہی الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے مگر اس تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ کہ ان تینوں مقامات میں تزکیہ کو تعلیم کتاب وحکمت سے مقدم کیا گیا ہے، علمائے بیان کا کہنا ہے کہ اس تقدیم وتاخیر میں اس عظیم حقیقت پر آگاہ بخشی گئی ہے کہ چہارگانہ مقاصد نبوت میں سے تزکیہ کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے کہ یہی مقصود بالذات اور اصلی غرض وغایت ہے اور کسی بھی کام کی غرض وغایت ذہنی اور فکری طور پر اس کام کے دوسرے تمام اجزاء سے مقدم اور وجود خارجی کے اعتبار سے ان سب سے مؤخر ہوتی ہے جیسے ہم کو بیٹھنے کے لیے کرسی کی ضرورت محسوس ہوجاتی ہے اس غرض کو حاصل کرنے کے لیے ہم پہلے تو کرسی کے الگ الگ اجزاء اور پھر اس کے بنانے اور بننے والوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں چنانچہ متفرق اجزاء کو ایک خاص ترتیب سے مجتمع کرکے کرسی بنائی جاتی ہے اور پھر بیٹھنے کی غرض پوری ہوتی ہے۔

حضرات آپ نے دیکھ لیا کہ ذہنی طور پر تو کرسی کی غرض وغایت یعنی اس پر بیٹھنا تمام اجزاء پر مقدم تھا لیکن بالفعل بیٹھنا ان تمام اجزاء سے مؤخر ہے سورہ بقرہ کی پہلی آیت میں تزکیہ کو اس کے وجود خارجی کی رعایت سے تعلیم کتاب وحکمت کے بعد ذکر کیا گیا ہے۔ اور بقیہ تین مقامات میں اس کی ذہنی اولیت کی بنا پر اس کو تعلیم کتاب وحکمت سے پہلے ذکر کیا گیا ہے، بہرحال اس کا جملہ مقاصد نبوت کی غرض وغایت اور نتیجہ وثمرہ ہونا مسلم ہے جس سے قرآنی نقطۂ نظر سے تزکیہ کی بے مثال اہمیت کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔

کلام الٰہی میں کبھی کبھی ترتیب یوں بھی ہوتی ہے کہ مختلف اشیاء کو ایک خاص پہلو سے ادنیٰ سے اعلیٰ یا اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف التدریج بیان کیا جاتا ہے مثلاً حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ میں ترتیب کو ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف یوں چلایا گیا ہے کہ سب سے پہلے میتہ کا ذکر ہے جو محض اسلیے حرام ہے کہ اسمیں خون باقی رہ گیا ہے اگر یہ خون شرعی طریقہ سے نکالا جاتا تو گوشت پوست قطعاً

حرام نہ ہوتا۔ دوسرے نمبر پر اسی وجۂ حرمت یعنی خون کا ذکر ہے جس کی حرمت لذاتہ ہے لہذا ظاہر ہے پہلی قسم کی حرمت سے اشد ہے تاہم خون کی بعض قسمیں حلال بھی ہیں مثلاً جگر اور تلی، چنانچہ خون کی حرمت میں بھی فی الجملہ خفت پیدا ہو گئی تیسرے نمبر پر لحم الخنزیر کا ذکر ہے خنزیر پورے کا پورا نجس العین ہے اسی لیے اس کے تمام اجزائے بدن حرام قطعی ہیں اور اس کا [illegible] قسم [illegible] درجے میں بھی حلت کی حامل نہیں تو یہاں حرمت [illegible] دوسرے درجے کی حرمت سے بھی اشد ہے جو تھے نمبر پر [illegible] ہیں جن کی نجاست و نجاست کا یہ عالم ہے کہ روح انسانی کو براہ راست متاثر کرتی ہیں اور اس کو شرک کی آلائشوں سے آلودہ کرتی ہیں چنانچہ ان کی حرمت متذکرہ اوّل تمام درجوں سے شدید ترین ہے گویا کہ اس آیت میں حرمت کے پہلو سے ادنیٰ سے اعلیٰ یعنی خفت سے شدت کی طرف ترقی ہے۔ بالکل اسی انداز کے ساتھ سورۃ بقرہ کی آیت ۱۲۹ ہے جہاں تزکیہ کو تعلیم کتاب و حکمت کے بعد ذکر فرمایا گیا ہے۔ [illegible] نبوت کو سہل سے صعب اور آسان سے مشکل کی طرف ترقی کے ساتھ ذکر فرمایا گیا ہے چنانچہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ تلاوت کتاب سے تعلیم کتاب اور تعلیم کتاب سے تعلیم حکمت مشکل ہے اور تزکیہ کا عمل تو ان سب سے بڑھ کر مشکل ہے کہ اس میں تعلیم کتاب و حکمت کی تمام تفصیلات کا عملی نمونہ پیش کرنا ہوتا ہے جو بلاشبہ نرے وعظوں، تقریروں اور تحریروں سے بدرجہا جانگسل اور صبر آزما کام ہے اور شاید یہی چیز نبوت و رسالت کے لیے انتخاب انسانیت کی وجہ امتیاز ہے نہیں تو فقط تلاوت و تعلیم کے لیے تو فرشتے بھی کافی ہو سکتے تھے۔

قابل قدر سامعین! [illegible] سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ تزکیہ سراسر عملی چیز ہے چنانچہ اس کی کوئی مہم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے چلانے والے خود اس سے بوجہ اتم متصف نہ ہوں یہی تزکیہ احادیث میں احسان کہلاتا ہے حدیث جبریل میں ایمان و اسلام کے بعد اس کی حقیقت پر یوں روشنی ڈالی گئی ہے۔ [illegible] عبد الله كانك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك کہ تو اللہ تعالیٰ کی ایسی بندگی کرے جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے اگر استحضار کا یہ بلند مقام حاصل نہ ہو تو کم از کم یہ تو ہو کہ جیسے خدا تمہیں دیکھ رہا ہے اس حدیث سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ عبادت ایک عام مفہوم رکھتا ہے اور احسان اس کی ایک خاص شکل کو کہتے ہیں جس سے لازماً یہ نتیجہ بھی خود بخود برآمد ہوتا ہے کہ بندگی و عبادت بلا احسان بھی ممکن ہے یہ ایک عظیم مغالطہ ہے جو ہمارے فقہی اطلاقات سے پیدا ہوا ہے اسی لیے میں چاہتا

ہوں کہ اس سلسلے کی چند توضیحات بھی سامعین کے گوش گزار کروں۔ تمام فقہائے کے سرخیل و سرتاج امام ابوحنیفہ نے فقہ کی تعریف یوں فرمائی ہے۔ "معرفۃ النفس مالہا وما علیہا" یعنی آدمی کا تمام منافع و مضرات کا سمجھ لینا فقہ ہے۔ فقہ کی اس جامع تعریف میں عقائد، اعمال اور اخلاق سب کے سب آجاتے ہیں لیکن بعد کے ادوار میں عقائد کے لیے کلام اور اخلاق کے لیے تصوف کے نام مخصوص ہوئے اور فقہ فقط اعمال ظاہری کا عنوان رہ گیا چنانچہ اس میں فقط بندگی کے ظاہری مظاہر سے بحث ہونے لگی۔ ان کی روح وحقیقت سے اس کا کوئی تعلق باقی نہ رہا۔ یہی فقہ بالخصوص تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں ایک معرکۃ الارا فن بن گیا۔ دینداری سے بڑھ کر دنیا داری سے دلچسپی رکھنے والے مسلمان بادشاہوں نے اسی فقہ ظاہری کی خوب خوب سرپرستی کی اور اپنے ہاں کے بڑے بڑے مناصب کو اسی کی بنیاد پر عطا کرنے لگے نتیجۃً علماء کی ایک بڑی اکثریت مناظرات اور مجادلات کا شکار ہوگئی جس کی بدولت دین کی اصل روح وحقیقت بُری طرح متاثر ہوئی اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر امام غزالیؒ نے فقہ کو علومِ آخرت کی فہرست سے نکال کر دنیاوی علم قرار دیا۔

فقہ کا علومِ ظاہری میں محدود ہو کر رہ جانے کی دوسری فطری وجہ یہ ہوئی کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو اللہ تعالیٰ نے معیت و رفاقتِ نبوّت کی وجہ سے بڑی وسعت نگاہ اور توفیقِ عمل سے نوازا تھا۔ ان میں نبی علیہ السلام کی جامعیت اور ہمہ گیری کا رنگ نسبتاً غالب تھا وہ بیک وقت دین کے تمام شعبوں عقائد، اعمال اور اخلاق کے معلّم بھی تھے۔ اور عامل بھی، بعد کے قرون میں یہ جامعیت باقی نہیں رہی جہاں تک اپنی شخصی زندگی اور اعمال واطوار کا تعلق ہے، مؤمنین صادقین ان تینوں پر یکساں طور پر کاربند رہے لیکن فطری قوتوں کی کمزوری اور اضمحلال کی وجہ سے ہر ایک نے اپنی طبعی مناسبتوں سے خدمتِ دین کے کسی ایک شعبے کو اپنے لیے مخصوص کر لیا۔ اور اپنی پوری زندگی اسی میں کھپا دی۔

چاروں ائمہ فقہ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کی سیرتیں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ اپنے طور پر ان تینوں حصّوں کے کس درجے کے حامل تھے لیکن اس کے باوجود ان کی علمی خدمات فقہ ظاہری کے میدان میں ملیں گی، بعد کے زمانوں میں فقہاء کی ایسی قسمیں پیدا ہوئیں جنہوں نے ظاہر کو سب کچھ سمجھ لیا بلکہ اس سے بڑھ کر اہل باطن کی تنقیص کرنے لگے۔

ان توضیحات کے بعد آئیے اب حدیثِ جبرائیل کی اہمیت سمجھئے اس سلسلے میں میں نبی علیہ السلام

کی اس حدیث کا اردو ترجمہ پیش کرنا کافی سمجھتا ہوں جو مشکوۃ کتاب العلم فصل اول میں آٹھویں نمبر پر نقل کی گئی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ سب سے پہلا شخص جس کے بارے میں قیامت کے دن فیصلہ کیا جائے گا ایک تو وہ شخص ہوگا جو شہید ہو گیا ہوگا پس اسکو حاضر کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اسکو اپنی نعمتیں یاد دلائیگا چنانچہ اس کو یاد آجائیں گی۔ پھر اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ تم نے ان نعمتوں کے باوجود کیا کیا وہ کہے گا کہ میں نے قتال کیا یہاں تک کہ شہید ہوا۔ باری تعالیٰ فرمائینگے کہ تو نے جھوٹ بولا تو نے تو اس لیے قتال کیا کہ تمہیں بہادر کہا جائے گا سو یہ تو کہا جا چکا اور اس کے علاوہ ایک وہ شخص ہوگا جس نے علم سیکھا اور سکھایا اور قرآن کو پڑھا اس کو پیش کیا جائے گا پھر اس کو اس کی نعمتیں یاد دلائی جائینگی وہ ان کو یاد لے گا پھر باری تعالیٰ اس سے پوچھیں گے کہ تم نے کیا کیا وہ کہے گا کہ میں نے علم سیکھا اور سکھایا اور تیرے لیے قرآن پڑھا۔ باری تعالیٰ فرمائینگے کہ تم نے جھوٹ بولا تم نے اسلئے علم سیکھا تاکہ آپ کو عالم کہا جائے اور تم نے اس لیے قرآن پڑھا تاکہ تم کو قاری کہا جائے سو یہ تو کہا جا چکا پھر اس کے بارے میں حکم ہوگا چنانچہ اسکو بھی منہ کے بل گھسیٹ کر آگ میں ڈالدیا جائے گا اور ایک وہ شخص ہوگا جس کو رب تعالیٰ نے وسعت اور تونگری دی اور قسم قسم کے مال عطا فرمائے اس کو پیش کیا جائے گا پھر اس کو نعمتیں یاد دلائی جائینگی اس کو یاد آجائیں گی ان سے باری تعالیٰ پوچھے گا کہ اس مال و دولت میں کیا کیا وہ کہے گا کہ ان تمام راستوں میں مال تیرے لیے خرچ کیا جس میں خرچ کرنا تجھے پسند ہے۔ باری تعالیٰ ارشاد فرمائینگے تو نے جھوٹ کہا تم نے اسلیے خرچ کیا تاکہ لوگ کہیں کہ بڑا سخی ہے۔ سو یہ کہا جا چکا پھر اس کے بارے میں حکم ہوگا چنانچہ اس کو اوندھے منہ آگ میں پھینک دیا جائے گا۔

حضرات سامعین! یہ مکالمہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اور ان لوگوں کے درمیان ہوگا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے احکام کو نہ صرف علمی طور پر جانتے ہیں بلکہ اعتقادی طور پر مانتے بھی ہیں۔ پھر احکام الٰہی پر ظاہری عمل بھی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ باری تعالیٰ نے ان کے اعمال کی نفی ہرگز نہیں فرمائی اس کے باوجود ان کے یہ اعمال قبول نہ ہوئے کیوں کہ احسان کی روح سے خالی تھے۔ آج ہمارا اور آپ سب کا اپنے اور دوسروں کے بارے میں مشاہدہ ہے کہ علم و اعتقاد کے باوجود ہمارے اعمال کا قبلہ درست نہیں۔ علماء و قراء اور اہل دولت و

ثروت کی زندگیاں تو سب کے سامنے ہیں لیکن جہاد کے نام سے لڑنے والوں کا تجربہ آپ میں سے اکثر کو نہ ہوگا۔

چنانچہ آپ یقیناً سوچتے ہوں گے کہ کیا جان کو ہتھیلی پر رکھ کر لڑنے والا بھی رضائے الہٰی کے علاوہ کسی دوسری غرض کے لیے بھی لڑ سکتا ہے؟ آپ کو اس استفسار پر میرا مثبت جواب سن کر یقیناً حیرت ہوگی لیکن مجھے کوئی حیرت نہیں۔ جہادِ افغانستان کے سلسلے میں اس حقیقت کا بار بار تجربہ ہوا ہے کئی لوگوں کو محض غصب کے طور پر روسی اسلحہ حاصل کرنے کے لیے اور بہت سوں کو بیرونی امداد میں حصہ داری بنانے کے لیے جہاد کا ڈھونگ رچاتے دیکھا ہے۔

مجھے بجا طور پر توقع ہے کہ اب تک کی گزارشات سے سامعین کے سامنے یہ بات کھل گئی ہوگی کہ جس چیز کو قرآن حکیم تزکیہ اور حدیثِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام احسان کے نام سے یاد کرتا ہے تصوف بعینہٖ وہی چیز ہے، اصطلاحات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ کونسی اچنبھے کی بات ہے۔ اب ہم کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ دشمنانِ تصوف کو تصوف کے اس پاک اور قابلِ فخر شجرۂ نسب کا علم نہیں اسلیئے اس کو بے اصل سمجھ کر بدعت قرار دے دیے ہیں یا قرآن وحدیث سے اس کے اس تعلق کو جانتے ہوئے اس کی مخالفت اور عداوت پر کمربستہ ہیں، دوسری صورت پہلی صورت سے بھی زیادہ قابلِ افسوس ہے لہٰذا یہی کہا جاسکتا ہے کہ:۔

ان کنت لا تدری فتلک مصیبۃ   وان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم

اب میں چاہتا ہوں کہ قرآن وحدیث اور تصوف کے تعلق پر صوفیاء کے سرخیل حضرت جنید بغدادیؒ کا ایک قول پیش کروں تاکہ اگر کسی کو میرے بارے میں "مدعی سست، گواہ چست" کا تاثر پیدا ہوا ہو تو اس کا بھی ازالہ ہو جائے۔ سید الطائفہ حضرت جنیدؒ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ

"ہمارا یہ علم کتاب وسنت میں مقید ہے پس جو کتاب وسنت سے الگ ہو اسکی پیروی نہ کی جائے۔ یہی وہ علمِ صافی ہے جو مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہے یہ اس علم والے کو طریق عبودیت پر چلنے کے لیے ستون ہے۔"

بعض لوگ تصوف کے خلاف کھولے ہوئے اپنے محاذ کو مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے

شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد رشید ابن قیم رحمہما اللہ تعالیٰ کا نام بھی بڑے شد و مد سے لیتے ہیں لیکن واضح رہے کہ ان بزرگوں نے نہ صرف یہ کہ صوفیاء اور ان کے کام کی مخالفت نہیں کی ہے بلکہ ان کے کام کو بہت اہم کام اور قرآن وحدیث کے عین مطابق بتلایا ہے امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں۔

"کتاب وسنت کا ہر معاملہ میں لحاظ اولیاء اللہ کے نزدیک متفق علیہ ہے اور مشائخ کے اقوال میں بکثرت اس کی ہدایت موجود ہیں۔" (الفرقان ص ۳۱ بحوالہ "تصوف کیا ہے")

حافظ ابن قیمؒ تو دلائل وشواہد سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ۔

"طریق کتاب وسنت ہی مقید ہے"

اور شیوخ عارفین کا اجماع نقل کرتے ہیں۔

"تصوف کتاب وسنت سے الگ کوئی چیز نہیں۔

اور بطور سند کے حضرات جنیدؒ، ابو حفصؒ، ابو سلیمان دارانیؒ، سہل بن عبداللہؒ۔ سریؒ، ابو یزیدؒ، احمد بن ابی الحواریؒ، ابو عثمان نیشاپوریؒ، ابو الحسن نوریؒ، محمد بن فضلؒ، عمرو بن عثمان مکیؒ، ابو سعید خرازؒ، ابن عطاؒ اور ان جیسے بے شمار دوسرے بزرگوں کے اقوال نقل فرماتے ہیں۔

حضرات! تصوف کی حقیقت معلوم ہو جانے کے بعد مجھے اس سلسلے کی ان لفظی مناقشات سے کوئی دلچسپی باقی نہیں جو اس کے مبدأ و مأخذ کے بارے میں روا رکھے جاتے ہیں کہ یہ لفظ "صوف" سے ماخوذ ہے یا "صفا" سے اور "صفو" سے نکلا ہو یا "صفہ" سے اور یا پھر یہ یونانی لفظ صوفیا سے لیا گیا ہو جس کے معنی حکمت کے بتائے جاتے ہیں، اس سے اس کی ماہیت و معنویت پر کوئی فرق نہیں آتا۔ لہٰذا اس پر اپنی گویائی اور آپ لوگوں کی سماعت خرچ کیے بغیر تصوف کے سلسلے میں ایک دوسری بحث کی طرف منتقل ہوتا ہوں۔

یہ بات تو معلوم ہو گئی کہ تصوف قرآن وحدیث سے الگ کوئی چیز ہرگز نہیں ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کی ذات پر یقین پیدا کرنے کا نام ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ یقین خدا تعالیٰ کے پیغمبر اور اس کے صحابہ سے بڑھ کر کس کو حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم نبی علیہ السلام اور اس کے صحابہؓ کو ان اشغال و اوراد میں مصروف نہیں دیکھتے ہیں جو صوفیاء کے ہاں رائج ہیں اگر تصوف کے بارے میں یہ دعویٰ واقعتہً صحیح ہے کہ وہ سنت ہی میں مقید ہے تو دونوں کے درمیان یہ واضح فرق کیوں موجود ہے۔ دین میں ذات حق کے یقین اور اس کی عظمت و کبریائی کے ہر دفعی دھیان و استحضار کی اہمیت و مقصودیت کا اندازہ ہو جانے کے بعد اس

تشویش کا ازالہ چنداں مشکل نہیں خود نبی علیہ السلام کی حالت شریفہ تو یہ تھی کہ نیند میں بھی اگرچہ آنکھیں سو جاتیں مگر قلب مبارک مشتغل باللہ اور مصروف مناجات ہوتا، حیات طیبہ کا کوئی لمحہ دھیان اور توجہ و استحضار سے خالی نہ ہوتا تا آنکہ انسانی حاجت کے وقت جو تھوڑا سا انقطاع ہو جاتا اس پر بھی فراغت کے بعد "غفرانک" فرما کر سراپا التجا ہو جاتے، آپؐ کی صحبت و رفاقت کی برکت سے قریب قریب یہی کیفیت صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں بھی پیدا ہو گئی تھی، قرآنی آیت "رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ" کے بعد اس مدعا پر کسی دوسری دلیل کی ضرورت باقی نہیں۔ نبوت اور اسکی صحبت یافتہ جماعت صحابہ کا دور گزر جانے کے بعد دین کی اس مطلوبہ کیفیت کو پیدا کرنے اور باقی رکھنے کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ ذکر و فکر کا اہتمام کیا جائے۔

چنانچہ امت کے تمام صلحاء نے ہر امتی کے لیے زندگی کے شب و روز میں ذکر و فکر کی خلوتوں کو بھی اس وقت تک نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار دیا جب تک کہ حضور و استحضار کا ضروری ملکہ پیدا نہ ہو۔ اس سلسلے میں بعض بندگان خدا کو اپنے ذاتی تجربات سے معلوم ہوا کہ ذکر و فکر کے بعض طریقے بعض دوسرے طریقوں کی بہ نسبت زیادہ انفع فی المقصود ہیں چنانچہ انہوں نے انکی باقاعدہ ترتیب و تدوین کے بعد اپنے متعلقین اور ان کی وساطت سے متعلقین متعلقین کو بھی تعلیم و تلقین شروع کر دی جس سے تصوف کے مختلف مسالک وجود میں آئے تاہم ان سب کا دو باتوں پر ہمیشہ کے لیے اجماع رہا پہلی بات یہ کہ مقصود بالذات حضوری یا ان کی مخصوص اصطلاح میں "نسبت" حاصل کرنی ہے ہمارے صوفیانہ اشغال محض ذرائع اور وسائل ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں اور دوسری بات یہ کہ متذکرہ مقصد کا حصول انہی ذرائع میں بند نہیں بلکہ اسکے لیے ہمارے تجویز کردہ طریقوں کے علاوہ اور بھی متعدد طریقے ہو سکتے ہیں، ان دونوں باتوں کے ضمن میں محققین اہل طریق کے چند اقوال ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ "ایضاح الحق الصریح" میں ارشاد فرماتے ہیں۔

"صوفیہ کے نفع بخش اشغال کی حیثیت دوا و معالجہ کی ہے کہ بوقت ضرورت ان سے کام لے اور بعد کو پھر اپنے کام میں مشغول ہو"

اور "صراط مستقیم" میں فرماتے ہیں۔

"ہر وقت اور ہر قرن کے اشغال جدا ہوتے ہیں اس لیے ہر طریق کے محققین تجدید اشغال کی کوشش فرماتے رہتے ہیں۔"

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

" ذکر کے نور کا ملاحظہ جو ابتدا میں تلقین ہوتا ہے وہ مقصدِ اصلی نہیں بلکہ تمہید ہوتا ہے۔"

" پاس انفاس وغیرہ سب حیل اس کے ہیں کہ ذکر مخیلہ میں قائم ہو جائے ورنہ اصل مقصود نہیں جب خیالِ ذکرِ ذات قائم ہو جائے تو زبان اور انفاس کسی کی ضرورت نہیں۔"

حضرت شاہ ولی اللہؒ القول الجمیل میں فرماتے ہیں

" یہ ہرگز خیال نہ کرنا کہ نسبت بجز ان اشغال کے اور کسی طرح حاصل نہیں ہوتی ہے۔"

اور انہی صوفیانہ حلقوں کی یہ بہت مشہور و معروف کہاوت ہے کہ

"طرق الوصول بقدر عدد الانفاس" یعنی حصولِ مقصد کے ذرائع تو کثرت میں سانسوں کے ہم عدد ہیں"

خلاصہ کلام یہ نکلا کہ مروجہ تصوف ذکر و فکر کے چند مخصوص طریقوں کا نام ہے۔ ذکر و فکر کی اہمیت سے تو کسی کو انکار نہیں کہ ولذکر اللہ اکبر، افلا یتدبرون القرآن، لعلھم یتفکرون اور انا مع عبدی اذا ذکرنی وتحرکت بی شفتاہ، لکل شئ صقالۃ وصقالۃ القلوب ذکر اللہ وما من شئ انجیٰ من عذاب اللہ من ذکر اللہ وغیرہ بکثرت آیات و احادیث میں اس کی تاکید کی گئی ہے۔ البتہ اس کے مخصوص طریقوں میں کلام کی گنجائش ہے۔ مگر یہ گنجائش اس وقت بالکل ختم ہو جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ذکر و فکر کے علاوہ بھی اکثر دینی مقاصد کے ذریعہ حصول اور طریقِ کار میں مرورِ زمانہ کے ساتھ تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اور علمائے امت نے نہ صرف ان کو مستحسن سمجھا ہے بلکہ ناگزیر بنایا ہے مثلاً دین سیکھنے اور سکھانے کا دین میں بہت اونچا مقام ہے نبی علیہ السلام اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے میں اس کے لئے فقط صحبت کافی ہو جایا کرتی تھی اس کا کوئی مستقل انتظام ہرگز نہیں تھا لیکن بعد میں ایسے حالات ہو گئے کہ صحبت اس مقصد کے لیے کافی نہیں رہی بلکہ کتابوں کی اور پھر مدرسوں کی بھی ضرورت پڑ گئی تو اللہ کے بندوں نے کتابیں لکھیں اور مدرسے قائم کئے اور اس کے بعد سے دین کی تعلیم کا سارا سلسلہ اسی سے چلا اور اب تک اسی سے قائم ہے۔ خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور میں قرآن پاک کے مختلف حصے مختلف صحابہ کے پاس متفرق طور پر موجود تھے حضرت ابو بکر صدیق رضؓ کے دورِ خلافت میں اس کی جمع و تدوین کی گئی اور پھر حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں اس کے اختلافِ قرات کو بھی ختم کر کے ایک مخصوص رسم الخط سے یک حرفی بنایا گیا یہ اور اس قسم کی اور کئی تبدیلیاں امت میں واقع ہوئیں۔

مگرچوں کہ یہ ایک ضروری مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وسائل کی وہ تبدیلیاں تھیں جو تبدیلیٔ زمانہ کی وجہ سے ضروری قرار پاگئی تھیں اسلئے کسی طرف سے بھی اسپر نکیر نہ ہوا۔ تو ذکر و فکر کے وسائل میں اس ضروری تبدیلی پر برہمی کی کیا وجہ جواز ہو سکتی ہے۔

کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ تصوّف علمی طور پر الحاد و بدعقیدگی اور عملی طور پر تعطّل پیدا کرتا ہے، اس سلسلے میں یہ عرض کرنا بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ جیسے کہ فی زمانہ ہمارے ہر شعبۂ حیات پر نااہلوں کا قبضہ ہے، تصوف کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں علم و فقاہت ہو، طب و حکمت ہو یا سلوک و معرفت ہو، ہر جگہ "زاغوں کے تصرّف میں عقابوں کے نشیمن" کی صورت حال ہے لہذا جیسے درباری مولویوں کی وجہ سے علم و فضل اور اشتہاری طبیبوں کی وجہ سے طب و حکمت کی ناقدری کرنی انتہائی ناانصافی ہوگی اسیطرح سے سبز پوشس مزارنشینوں اور آہن بردار ملنگوں کی وجہ سے تصوّف کو کوسنا تو کسی صحیح العقل انسان کا کام ہرگز نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح سے حقیقی زہد و تقویٰ کے حامل اپنے نامدار آبا و اجداد کی بوسیدہ ہڈیاں بیچنے والے، اور ان کے وابستگان و متعلقین کی دولتوں اور عصمتوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنے والے عیّار و مکار پیروں اور پیرزادوں کی عیاشیاں اور بدمعاشیاں بھی تصوف کی طرف منسوب کرنا وہ بھونڈی حرکت ہوگی جس پر کوئی بھی سنجیدہ آدمی تکلیف محسوس کیے بغیر نہیں رہے گا۔ اس جملہ معترضہ کے بعد اب اصل اعتراضات کا جواب سُن لیجئے۔

(جاری ہے)

(بقیہ درجۂ حکمت)

فجئت فختمت الانبیاءؑ[1] میں آیا اور میں نے انبیاءؑ کا سلسلہ ختم کر دیا

اس مضمون کی اور بہت سی حدیثیں مختلف حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ (نبوت و ختم نبوت کی مزید تفصیل کے لئے راقم کی کتاب "حدیث کا درایتی معیار" دیکھنی چاہیئے) (جاری ہے)

---

[1] مسلم ج ۲ کتاب الفضائل باب خاتم النبیین،

(قسط [illegible])

قرآنی علم و فہم کا درجہ حکمت

مولانا محمد تقی امینی

یہ مثالیں محض قریب الفہم بنانے کے لئے دی گئی ہیں ان سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہیئے - قرآن وحدیث میں شرح صدر (سینہ کھولنا) شق صدر (سینہ چاک کرنا) روشنی ڈالنے کی تعبیریں ہیں جن سے اس مزید نورانی قوت کی طرف اشارہ ہوتا ہے مثلاً قرآنِ حکیم میں ہے -

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۙ [۱]   کیا ہم نے آپؐ کا سینہ نہیں کھول دیا

یہ شرح صدر کار نبوت کے لائق بنانے کے لئے تھا جیسا کہ آگے کی آیت میں اس کے اثر سے وضاحت ہوتی ہے -

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۙ   اور آپؐ کے اوپر سے آپ کا
الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۙ   بوجھ اتارا جس نے آپؐ کی کمر
وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ؕ [۲]   جھکا دی تھی اور ہم نے آپؐ کا
ذکر بلند کیا -

شق صدر (سینہ چاک کرنا) کا ذکر مختلف حدیثوں میں ہے [۳] جن کی تشریح شاہ ولی اللہ نے اس طرح کی ہے -

اما شق الصدر وملؤه   لیکن شق صدر (سینہ چاک کرنا)
ایمانا فحقیقته غلبة انوار   اور اس کو ایمان سے بھرنے کی
الملكية وانطفاء لهب   حقیقت انوار ملکیہ کا غلبہ اور طبیعت

---

۱ الم نشرح آیت ۱   ۲ ایضاً آیت ۲-۳-۴
۳ مسند احمد بن حنبل ج ۳ ص ۱۴۹ حدیث انس بن مالک

الطبیعة وخضوعها
الی الفیض بہما من
حظیرة القدس [1]

شعلہ بجھ جاتا ہے۔ نیز
حظیرۃ القدس (عالم نور) سے فیض
قبول کرنے کی طرف طبیعت کا آمادہ
اور متوجہ ہو جاتا ہے۔

نبوت سے پہلے روشنی دیکھنے یا روشنی ڈالنے کا ذکر اس حدیث میں ہے۔

اقام رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم بمکة خمس
عشرة سنة یسمع الصوت
ویری الضوء سبع سنین
ولا یری شیئا وثمانی
سنین یوحی الیہ [2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ
میں پندرہ سال ٹھہرے سات
سال آواز سنتے اور روشنی
دیکھتے رہے اور کچھ نہ دیکھتے تھے
اور آٹھ سال آپؐ کی طرف وحی
کی جاتی رہی۔

اس مزید نورانی قوت پہنچانے کا اہم مقصد عالم نور سے فیض حاصل کرنے کی رکاوٹ دور کرنا معلوم ہوتا ہے اور سب سے بڑی رکاوٹ نامیاتی لہروں کے شعلے تھے جو شیطان کی آماجگاہ بنے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد ایک طرف نوری کرنوں کو مزید توانائی حاصل ہوئی اور دوسری طرف نامیاتی لہروں کے شعلے بجھ گئے پھر شعور و خواہش میں ہم آہنگی ہوئی اور عالم نور سے کسب فیض کا راستہ کھلا۔

شعلہ بجھنے کا ثبوت اس حدیث میں ہے۔

ما منکم من احد الا وقد
وکل بہ قرینہ من الجن
قالوا وایاک [illegible]

تم میں سے ہر ایک کا ہمنشین جن
شیطان ہے۔ صحابہؓ نے عرض
کیا اور آپؐ کا بھی اے اللہ کے

---

[1] حجۃ اللہ البالغۃ [illegible]

[2] مسلم کتاب الفضائل باب کم اقام [illegible] اللہ علیہ وسلم بمکۃ والمدینۃ ومسند احمد بن حنبل ج ۱ ص ۲۶۶ عن ابن عباس

الله قال وایای الا
ان الله اعانی علیہ
فاسلم فلا یامرنی
الا بخیر ؎

رسولؐ آپؐ نے فرمایا میرا بھی
ہے لیکن اللہ نے میری مدد کی اور وہ
مطیع ہو گیا اب وہ صرف خیر و بھلائی
کی ترغیب دیتا ہے۔

عالم نور سے کسب فیض کے لئے راستہ کھلنے کا ثبوت غار حرا کے واقعہ میں ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دبانے اور بھینچے کی جو روش اختیار کی وہ غالباً عالم نور سے فیض کو جانچنے اور مزید کم کرنے کے لئے تھی کہ جس کے بعد ہی وحی کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔

فجاء الملك فقال اقرأ
قلت ما انا بقارئ قال
فاخذنی فغطنی حتی بلغ
منی الجهد ثم ارسلنی
فقال اقرأ فقلت ما انا
بقارئ فاخذنی فغطنی
الثانیة حتی بلغ منی الجهد
ثم ارسلنی فقال اقرأ
فقلت ما انا بقارئ فاخذنی
فغطنی الثالثة حتی بلغ
منی الجهد ثم ارسلنی
فقال اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ
الَّذِي خَلَقَ خَلَقَ الْإِنسَانَ
مِنْ عَلَقٍ اقْرَأْ وَرَبُّكَ
الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ

فرشتہ آیا اور کہا اقرأ، پڑھیئے
آپؐ نے فرمایا میں پڑھا ہوا نہیں
ہوں۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ فرشتہ
نے اس زور سے مجھ کو پکڑ کر دبایا
کہ مجھ کو مشقت برداشت کرنی
پڑی، پھر اس نے چھوڑا اور کہا
کہ پڑھیئے میں نے کہا میں پڑھا
ہوا نہیں ہوں، پھر اس نے زور
سے بھینچا اور مجھے مشقت برداشت
کرنی پڑی، پھر مجھے چھوڑا اور
کہا کہ پڑھیئے میں نے کہا کہ پڑھا
ہوا نہیں ہوں پھر اس نے مجھے بھینچا اور
پھر چھوڑا مجھے ویسی ہی مشقت
برداشت کرنی پڑی، پھر اس
نے اقرأ کی پانچ آیتیں پڑھیں

؎ مسلم صفات المنافقین، باب تحریش الشیطان وبعثہ سرایاہ

بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ
مَا لَمْ یَعْلَمْ - ؎۱

اس مزید قوت پہنچانے سے صرف شعلے بجھتے ہیں خواہشات (طبعی زندگی کے تقاضے و مطالبے) باقی رہتی ہیں کہ اگر یہ بھی جل جائیں تو بشریت ختم ہو کر رسول کی زندگی دوسروں کے لئے نمونہ نہ قرار پائے - چنانچہ اس کے ثبوت میں ایک طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی موجود ہے اور دوسری طرف عالم نور سے کسب فیض کے وقت کی وہ کیفیات موجود ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آتی تھیں - مثلاً نزولِ وحی کے وقت چہرہ متغیر ہو جانا سردی کے زمانہ میں جبینِ اقدس پر پسینے کے قطروں کا نمودار ہونا، اعصاب کا غیر معمولی بار محسوس کرنا اور استغراق کی کیفیت طاری ہونا وغیرہ ؎۲

یہ مختلف کیفیات طبعی زندگی کے تقاضے و مطالبے کی موجودگی کا نتیجہ تھیں اور ان کے ساتھ زبردست تصادم اس وقت ہوتا تھا جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقامِ نور میں ڈوب کر کسب فیض کرتے تھے - یہ مقام اس قدر لطیف ہے کہ اس کی لطافت طبعی زندگی کی ادنیٰ کثافت بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے لامحالہ اس مقام کے مسافر کو بلند ہونے کے لئے سخت قسم کی کشمکش سے دوچار ہونا پڑے گا جس کے آثار اعضاء و جوارح اور اعصاب پر ظاہر ہونا لازمی ہیں -

یہ مزید قوت آخری حد تک پہنچا دینے کا نتیجہ تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم کر دی گئی - اب آپ کے بعد نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ رسول آئے گا - قرآنِ حکیم میں ہے -

---

؎۱ بخاری ج ۱ باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (مسلم باب المبعث و بدء الوحی -

؎۲ بخاری ج اکتاب المناسک باب غسل الخلوق ثلاث مرات و مسلم و مشکوۃ باب المبعث و بدء الوحی -

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ؕ [1]	محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسولؐ اور خاتم النّبیینؐ ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

عربی لغت ومحاورے میں ختم کے معنی بند کرنے، مہر لگانے، ختم کر دینے اور کام سے فارغ ہو جانے کے ہیں۔ مثلاً:

ختم الاناء	برتن کا منہ بند کر دیا
ختم الکتاب	خط پر مہر لگا دی
ختم علی القلب	دل پر مہر لگا دی
ختم الشیٔ (بلغ آخرہ)	شئ کے آخر تک پہنچ گیا
خاتم القوم (آخرہم)	قوم کا آخری آدمی
ختم العمل (فرغ من العمل) [2]	کام سے فارغ ہو گیا

مزید قوت پہنچانے کی آخری حد لوگوں کو معلوم نہ تھی اس لئے وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا کے ذریعہ ہر قسم کے شکوک وشبہات ختم کر دیئے گئے کہ اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے اور ختم نبوت کے وقت کو بھی وہی جانتا ہے کہ کب اس کا وقت ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان الرسالۃ والنبوۃ قد انقطعت فلا رسول بعدی ولا نبی [3]	رسالت اور نبوت ختم ہو گئی میرے بعد نہ کوئی رسولؐ ہے اور نہ نبی۔

(بقیہ صفحہ ۶۱ پر)

---

[1] الاحزاب آیت ۴۰

[2] اقرب الموارد، لسان العرب اور قاموس وغیرہ۔

[3] مسند احمد بن حنبل عن انس بن مالک (ترمذی کتاب الرؤیا باب ذہاب النبوۃ

ادارہ

تعارفِ کتب

(۱)

کتاب : 'AGRICULTURAL EXTENSION IN ISLAMIC CULTURAL MILIEU'

مصنف : مظفر حسین

صفحات : ۱۵۴

ناشر : ریسرچ یونٹ، نیشنل سائنس کونسل، اسلام آباد

چوہدری مظفر حسین ہمارے ایسے مایہ ناز زرعی سائنسدان ہیں جو اپنے شعبہ کے فنی پہلوؤں کے دوش بدوش اس کے وسیع تر نظریاتی پہلو کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر انہوں نے سیکولر مغرب کی اس اساسی آئیڈیالوجی کو مسترد کر دیا ہے جس کی رُو سے ترقی محض مادی ترقی سے عبارت ہے۔ اس بات کو وہ ترقی برائے ترقی سے تعبیر کرتے ہیں۔ چوہدری مظفر حسین اس کے مقابلے میں ترقی کو نظریاتی اور تہذیبی ارتقا کے ایک عامل اور اس کے ضمنی حاصل کے طور پر دیکھتے ہیں ــــ انہوں نے زرعی توسیع و ترقی سے متعلق نظری مسائل اٹھائے ہیں اور یہ بات کسی شبہ کے بغیر کہی جا سکتی ہے کہ جدید اسلامی دنیا میں فاضل مصنف اوّلین مفکر ہیں جنہوں نے اس قسم کے مسائل کی طرف ہماری توجہ دلائی ہے۔ مغرب میں بعض ایسے ماہرین نے اس موضوع کو اٹھایا ہے جو اپنے معاشرے کے مروّجہ نظام سے مطمئن نہیں۔ ان میں سے اے۔ ٹی۔ موشر کا ذکر کیا جا سکتا ہے چند برس قبل اس کی کتاب 'THINKING ABOUT RURAL DEVELOPMENT' شائع ہوئی تھی۔ موشر نے اس کتاب میں نظریاتی ڈھانچے کے اندر دیہی زندگی کی تعمیرِ نو کا تصوّر پیش کیا تھا۔ یہ کتاب چوہدری مظفر حسین کی نظر سے گزری ہے اور انہوں نے اس کے خیالات سے قدرے استفادہ بھی کیا ہے۔

زراعت اور زرعی ترقی سے متعلق اسلامی تعلیمات کی طرف توجہ دلانے اور اس ترقی و توسیع کو اسلامی تناظر میں مربوط کرنے کی کوشش سے مصنف کتاب ہٰذا نے اسلام کو مکمل ضابطۂ حیات ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ تو ہمارے ایمان کی اساس ہے۔ ہاں، انہوں نے

جذبہ اور اصحاب فکر دانشوروں میں ہوتا ہے۔ قرآن کریم کا بالعموم اور فکرِ اقبالؒ کا بالخصوص آپ کی سوچ پر گہرا اثر ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے آخر میں دیئے گئے حوالوں سے آپ کے وسیع المطالعہ ہونے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ آپ نے کثیر تعداد میں ایشیائی، یورپی اور امریکی مصنفین کی نگارشات سے استفادہ کیا ہے۔ اور ان کے حوالے سے اپنے موقف کی حمایت میں استشہاد کیا ہے۔ کتاب کا ایک مکمل باب QURANIC VISIONS کے عنوان سے ہے جس سے چوہدری صاحب کی قرآنی مضامین میں گہری مہارت کا ہر قاری اندازہ لگا سکتا ہے۔ کتاب کی طباعت اور جلد بندی بہت خوبصورت ہوئی ہے۔ چنانچہ اس طرح یہ کتاب معنوی افادیت اور حسنِ ظاہری ہر دو کا حسین مرقع ہے۔

"ڈاکٹر ابصار احمد"

(۲)

کتاب : کانٹ اور کرکیگارڈ
ایک تقابلی مطالعہ (بزبان انگریزی)
مصنف : ڈاکٹر ابصار احمد

سالِ اشاعت : ۱۹۸۳ء

صفحات : ۱۶۲

قیمت : ۴۰ روپے

ادارہ : کارواں بک ہاؤس کچہری روڈ، لاہور

یہ کتاب عصرِ حاضر کے دو ممتاز مغربی فلاسفہ کانٹ اور کرکیگارڈ کے فکر انگیز تقابلی مطالعے پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں فلسفی بظاہر فکر کی الگ تھلگ دو روایات کے علمبردار ہیں۔ ان میں سے اوّل الذکر کانٹ، مغربی فلسفے کی عمومی روایت کا بہت اہم نمائندہ ہے ــــ مؤرخینِ فلسفہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس نے مغربی فلسفہ کی تاریخ میں کوپرنیکسی انقلاب برپا کیا تھا۔ برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے کہ مغربی فلسفے کی کم و بیش پچیس سو سالہ تاریخ کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے : ایک کانٹ سے پہلے کا دور اور دوسرا کانٹ سے بعد کا دور۔

گویا فلسفہ کی اس طویل تاریخ میں کانٹ حد امتیاز کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے فلسفے سے عہدِ حاضر کے فلسفیانہ نظاموں نے جنم لیا۔ ہیگل اور کارل مارکس اور ان کے بعد آنے والے مغربی فلاسفہ کانٹ کے مرہونِ منت ہیں۔ برطانیہ و جرمنی کے رومان پرست شاعروں اور ادیبوں نے بھی اس کے اثرات قبول کئے ہیں۔ دوسری طرف کرکیگارڈ معاصر وجودی فلسفے کا باوا آدم ہے۔ ہیڈیگر، سارتر، جیسپرز اور مارسل جیسے دانش وروں نے اس سے تخلیقی تحریک حاصل کی ہے۔ علاوہ ازیں معاصر مسیحی فکر پر بھی اس کی گہری چھاپ ہے۔

ڈاکٹر ابصار احمد نے ماہرانہ تنقیدی صلاحیت سے کام لیتے ہوئے ان دو بڑے فلاسفہ کے مابین مشترک نکات تلاش کئے ہیں جنہیں عام طور پر ایک دوسرے سے قطعی طور پر مختلف سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس طرح انہوں نے جدید مغربی فلسفہ کے تنقیدی مطالعے کی سمت میں ایک اہم قدم اٹھایا ہے۔ یہ کتاب برطانیہ کی ریڈنگ یونیورسٹی میں مصنف کے پوسٹ گریجویٹ مطالعہ کے دوران مقالہ کے طور پر لکھی گئی تھی۔ اس مقالہ کی نگرانی مشہور انگریز فلسفی ڈاکٹر ایچ۔ اے ہوجزنے کی۔ کتاب کے فلیپ پر ان کی رائے بھی موجود ہے جس میں انہوں نے ڈاکٹر ابصار احمد کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے کانٹ اور کرکیگارڈ میں ایسی مشابہتیں تلاش کی ہیں جنہیں ابھی تک شناخت نہیں کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر ابصار احمد نے دونوں فلسفیوں کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے علمیاتی مسئلہ کو بنیاد نہیں بنایا۔ اس کے برعکس وہ دونوں کے مذہبی اور اخلاقی تصورات کا موازنہ کرتے ہیں۔ انہوں نے بجا طور پر یہ اصول وضع کیا ہے کہ کسی اخلاقیاتی نظام کا دار و مدار انسان کے تصور پر ہوتا ہے۔ اصل میں کسی فکری نظام کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے مرکزی نکتہ یہی ہونا چاہیئے کہ اس میں انسان کا مقام کیا ہے۔ اور انسانی حقیقت اور مقدر کے بارے میں اس کی رائے کیا ہے۔

اخلاقیات کے باب میں کانٹ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اہم بات یہ نہیں کہ انسان کیا کرتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ کیوں کرتا ہے۔ عمل پر نیت کو فوقیت حاصل ہے۔ اگر نیت صالح ہے تو صالح عمل اس سے جنم لے گا۔ کانٹ نے اس مشہور اصول کو فلسفیانہ جواز بھی عطا کیا ہے کہ 'جو تم اپنے لئے پسند نہیں کرتے وہ اپنے بھائی کے لئے بھی پسند نہ کرو'۔ وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ اخلاقی زندگی کے لئے ضروری ہے کہ انسانیت کو کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہ سمجھا جائے بلکہ بذاتِ خود مقصد قرار دیا جائے۔ کرکیگارڈ کے نزدیک مذہبی سطح انسانی خودی کی تکمیل کی اعلیٰ ترین سطح ہے۔ تخلیقی

شخصیت کا وہ مقام ہے جہاں انسان سماجی، نفسیاتی اور تہذیبی بندھنوں اور جمود طاری کرنیوالے عوامل سے ماورا ہو کر اپنے انتخاب کے بل بوتے پر مثالی زندگی بسر کرتا ہے۔ کانٹ مذہبی زندگی میں عقلی عناصر پر زور دیتا ہے اور مذہب کی عقلی تعبیر کی جستجو کرتا ہے۔ جب کہ کرکیگارڈ شخصی تعلق کے حوالے سے خدا کو دریافت کرنا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر ابصار احمد نے "کانٹ اور کرکیگارڈ: ایک تقابلی مطالعہ" کو دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصّہ میں جدید اخلاقی نظریے کا جائزہ لیا گیا ہے اور یہ اصول وضع کیا ہے کہ کسی اخلاقی نظام یا حکم کی اساس تصورِ انسان پر ہوتی ہے۔ کانٹ اور کرکیگارڈ کے فکری نظامات کی بنیاد بھی ان کے تصورِ انسان پر ہے۔ اسی طرح کتاب کے پہلے حصّے میں کرکیگارڈ کی زندگی کی جمالیاتی اور اخلاقی سطحوں اور کانٹ کے تصورِ اخلاق کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے حصّے میں دونوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ابصار احمد نے زیادہ توجہ اس نکتے پر صرف کی ہے کہ کانٹ اور کرکیگارڈ دونوں اخلاقی انتخاب کے سلسلے میں انسان کے باطن کی اہمیت پر زور دیتے ہیں اور یہ بھی سمجھتے ہیں کہ حسیاتی مسرت اخلاقی جستجو کا مناسب آدرش نہیں۔

یہ بات نہیں کہ زیرِ تبصرہ کتاب محض درسی ضرورت پوری کرتی ہو۔ اس میں ایسے مسائل زیرِ بحث آئے ہیں جو ہمارے عہد کے انسان کے لیے حسیاتی اہمیت کے حامل ہیں۔ لہٰذا طلبہ کے علاوہ فلسفیانہ ادب اور غور و فکر سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے لئے بھی اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ خوش قسمتی سے ہمارے ہاں اب ایسی سنجیدہ فکری کاوشوں کے قارئین کی تعداد میں رفتہ رفتہ اضافہ ہو رہا ہے ــــ ڈاکٹر ابصار احمد کی یہ فکر انگیز تصنیف ان قارئین کی ذہنی توقعات پر یقیناً پوری اترے گی۔ یہ محض درسی مطالعہ نہیں بلکہ اس میں مصنّف کے ذاتی فلسفۂ حیات اور نظریات کی جھلکیاں بھی جا بجا موجود ہیں۔ ڈاکٹر ابصار احمد ایک علمی مذہبی گھرانے سے تعلق رکھنے والے بیدار مغز اور جواں ذہن سکالر ہیں۔ امید کرنی چاہیئے کہ ہمیں آئندہ بھی ان کے قلم سے جدید مغربی فلسفے کے تنقیدی مطالعات پڑھنے کو ملیں گے۔

(قاضی جاوید)

آپ کے احباب کے لئے :

بہترین تحفہ

ڈاکٹر اسرار احمد کی مقبول تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

[illegible]

نوٹ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مرکزی انجمن خدام القرآن —— لاہور

کے۔ ماڈل ٹاؤن ◎ لاہور فون ٨٥٢٦١١

Regd. L. No. 8193

'HIKMAT-E-QURAN' MONTHLY LAHORE

Vol 3 | JULY 1984 | No. 5

فہمِ قرآن

اور

خصوصاً قرآن کے منضبط اور مربوط مطالعہ کے ضمن میں ——

ڈاکٹر اسرار احمد

کی نشری (ریڈیو) تقاریر پر مبنی ایک اہم تصنیف

قرآن مجید کی سورتوں کا اجمالی تجزیہ

(سورۃ الفاتحہ تا سورۃ الکہف)

ضرور مطالعہ کیجیے

◎

کتاب کا دوسرا ایڈیشن حال ہی میں چھپ کر آیا ہے

اعلیٰ سفید کاغذ ○ عمدہ کتابت ○ دیدہ زیب طباعت

ہدیہ : ۱۰ روپے